فہرست

شذرات	تراویح کی نماز	جاوید احمد غامدی	۲
	لیلۃ القدر	منظور الحسن	۶
قرآنیات	آل عمران (۳: ۴۲-۴۴)	جاوید احمد غامدی	۹
معارف نبوی	نماز کی پہلی صف میں شمولیت کی فضیلت	معز امجد	۱۱
	ہمارا دین	طالب محسن	۱۴
دین و دانش	قانون عبادات (۱۵)	جاوید احمد غامدی	۲۳
	صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟	ساجد حمید	۳۱
نقطۂ نظر	اسلام کا نظام تعلیم	خلیفہ شجاع الدین	۳۷
حالات و وقائع	خلافت راشدہ کا تعارف	طالب محسن	۴۳
	محدثین	محمد رفیع مفتی	۵۳
	فکری قیادت اور اس کے کرنے کے کام	ریحان احمد یوسفی	۶۳
تبصرۂ کتب	''تذکار بگویہ''	نعیم احمد بلوچ	۶۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

تراویح کی نماز

تراویح کی نماز کوئی الگ نماز نہیں ہے۔ یہ درحقیقت تہجد ہی کی نماز ہے جسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے لوگوں نے رمضان کے مہینے میں بالالتزام جماعت کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز کبھی گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھی۔ اس باب میں اصل کی حیثیت جس روایت کو حاصل ہے، وہ یہ ہے:

عن ابی سلمة بن عبد الرحمن انه اخبره انه سأل عائشة رضی اللّٰه عنها: کیف کانت صلاة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی رمضان؟ فقالت: ما کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیره علی احدیٰ عشرة رکعة: یصلی اربعاً، فلا تسئل عن حسنهن و طولهن، ثم یصلی اربعاً، فلا تسئل عن حسنهن وطولهن، ثم یصلی ثلاثاً. (بخاری، رقم ۱۱۴۷)

''ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے بتایا کہ انھوں نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیا ہوتی تھی؟ ام المومنین نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ رمضان میں کبھی گیارہ رکعت سے زیادہ پڑھتے تھے اور نہ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں۔ آپ چار رکعت اس طرح پڑھتے کہ بس کچھ نہ پوچھو کہ ان کا حسن کیا تھا اور وہ کتنی لمبی ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعت پڑھتے۔ ان کے بارے میں بھی کچھ نہ پوچھو کہ ان کا حسن کیا تھا اور وہ کتنی لمبی ہوتی تھیں۔ پھر آخر میں تین رکعت پڑھتے تھے۔''

اس میں شبہ نہیں کہ بعض روایات میں تیرہ رکعتوں کا ذکر بھی ہوا ہے، لیکن اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ نماز چونکہ فرض تھی، اس لیے آپ کبھی کبھی اس سے پہلے یا اس کے بعد اسی طرح دو رکعت نفل نماز پڑھتے تھے، جس طرح ہم مثلاً فجر سے پہلے یا مغرب کے بعد یہ نفل پڑھتے ہیں، لیکن بعض لوگوں نے غلطی سے انھیں اصل کے ساتھ شامل سمجھ لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے اس نماز کے جو طریقے ثابت ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ دو دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، پھر ایک رکعت سے یہ نماز وتر کر دی جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ چار چار رکعتیں عام طریقے پر پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، پھر تین رکعتیں بغیر تشہد میں بیٹھے مسلسل پڑھ کر سلام پھیرا جائے اور اس طرح یہ نماز وتر کر دی جائے۔

۳۔ دو یا چار یا چھ یا آٹھ رکعتیں تشہد میں بیٹھے بغیر مسلسل پڑھ کر تشہد کے لیے بیٹھا جائے، پھر سلام پھیرے بغیر اٹھ کر ایک رکعت پڑھی جائے اور سلام پھیرا جائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نماز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سراً و جہراً، دونوں طریقوں سے قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان دونوں کے بین بین کا لہجہ اختیار کیا جائے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا. (۱۷:۱۱۰)

''اور اپنی اس رات کی نماز میں نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، ان دونوں کے بین بین کا لہجہ اختیار کرو۔''

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد اپنے صحابہ کو بھی اسی کا پابند کیا۔ ترمذی میں ہے:

عن ابی قتادة : ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال لابی بکر: مررت بك وانت تقرأ وانت تخفض من صوتك فقال: انی اسمعت من ناجیت، قال : ارفع قلیلاً ، وقال لعمر : مررت بك وانت تقرأ وانت ترفع صوتك، قال: انی اوقظ الوسنان واطرد الشیطان، قال : اخفض قلیلاً. (رقم ۴۴۷)

''ابو قتادہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: میں تمھارے پاس سے گزرا تو تم (رات کی نماز میں) بہت پست آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: میں اسے سنا تا ہوں جو میری سرگوشی سنتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے کچھ بلند کر لو۔ پھر آپ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا: میں تمھارے پاس سے گزرا تو تم بہت بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: میں سوتوں کو جگاتا اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اسے کچھ پست کر لو۔''

www.almawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس نماز کا اصل وقت تو جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ مزمل سے واضح ہے، سو کر اٹھنے کے بعد ہی کا ہے اور اسی وجہ سے اسے نماز تہجد کہا جاتا ہے۔ لیکن کوئی شخص اگر یہ سعادت حاصل کرنے میں کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے تو وہ یہ نماز سونے سے پہلے بھی پڑھ سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ایکم خاف ان لا یقوم من اٰخر اللیل فلیؤتر ثم لیرقد و من وثق بقیام من اللیل

''تم میں سے جسے اندیشہ ہو کہ وہ رات کے آخری حصے میں نہ اٹھ سکے گا، اسے چاہیے کہ وہ سونے سے پہلے اپنی

فليؤتر من اٰخره فان قرأة اٰخر الليل محضورة و ذلك افضل. (مسلم، رقم ۱۶۳)

نماز وتر کر لے، لیکن جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ یقیناً اٹھے گا، اسے یہ نماز رات کے آخری حصے ہی میں پڑھنی چاہیے، اس لیے کہ آخر شب کی قرأت بڑی حضوری کی چیز ہے اور وہی افضل ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نماز ہمیشہ تنہا پڑھتے تھے۔ تاہم رمضان کے کسی مہینے میں جب آپ تہجد کے لیے اٹھے اور آپ نے اپنے حجرے سے نکل کر باہر مسجد میں نماز پڑھی تو آپ کی اقتدا کے شوق میں عام مسلمان بھی نماز کے لیے جمع ہونے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو چند دنوں کے بعد یہ سلسلہ اس اندیشے سے منقطع کر دیا کہ آپ کی طرح مبادا یہ عام مسلمانوں پر بھی فرض قرار دے دی جائے۔ بخاری میں ہے:

ان عائشة رضى اللّٰه عنها اخبرته ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم خرج ليلة من جوف الليل فصلى فى المسجد، و صلى رجال بصلاته فاصبح الناس فتحدثوا؛ فاجتمع اكثر منهم فصلى فصلوا معه، فاصبح الناس فتحدثوا فكثر اهل المسجد من الليلة الثالثة ، فخرج رسول اللّٰه فصلى بصلاته. فلما كانت الليلة الرابعة عجز المسجد عن اهله حتى خرج لصلاة الصبح ، فلما قضى الفجر اقبل على الناس فتشهد، ثم قال : اما بعد ، فانه لم يخف على مكانكم ولكنى خشيت ان تفرض عليكم فتعجزوا عنها. (بخاری، رقم ۲۵۱۲)

''ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عروہ بن زبیر کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدھی رات کے وقت نکلے اور آپ نے مسجد میں نماز پڑھی۔ وہاں کچھ لوگ آپ کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔ انھوں نے صبح اس کا ذکر کیا تو دوسرے دن زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ اس رات بھی آپ نے مسجد میں نماز پڑھی تو لوگوں نے آپ کے ساتھ یہ نماز ادا کی۔ صبح پھر اس کا ذکر ہوا تو تیسری رات نمازیوں کی ایک بڑی تعداد مسجد میں آ گئی۔ آپ اس رات پھر نکلے اور لوگوں نے آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ پھر چوتھی رات ہوئی تو مسجد لوگوں سے اس طرح بھر گئی کہ اس میں کسی آنے والے کے لیے جگہ باقی نہ رہی۔ لیکن اس رات آپ صبح سے پہلے نہیں نکلے، بلکہ فجر ہی کے وقت باہر آئے۔ پھر فجر کی نماز کے بعد آپ نے کلمات شہادت پڑھے اور فرمایا: میں تم لوگوں کے آنے سے بے خبر نہ تھا، لیکن مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ کہیں تم پر فرض نہ کر دی جائے اور پھر تم اسے ادا نہ کر سکو۔''

چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک لوگ گھروں اور مسجدوں میں اسے بالعموم اپنے طور پر ہی پڑھتے تھے،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں تک کہ حضرت عمر ایک دن مسجد کی طرف آئے تو انھوں نے دیکھا کہ لوگ مختلف ٹکڑیوں میں اس طرح یہ نماز پڑھ رہے ہیں کہ کوئی شخص تنہا تلاوت کر رہا ہے اور کچھ امام کی اقتدا میں ہیں۔ اس نماز میں چونکہ سری تلاوت کی اجازت نہیں ہے، اس وجہ سے مسجد میں عجیب بے نظمی کی کیفیت تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے آداب تلاوت کے لحاظ سے اسے پسند نہیں فرمایا۔ چنانچہ آپ نے ابی بن کعب کو اس نماز کے لیے لوگوں کا امام مقرر کر دیا۔

ایک دوسری رات آپ پھر تشریف لائے اور فرمایا: 'نعم البدعة هذه' (یہ نئی چیز ہے، لیکن اچھی ہے)۔ آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اس نماز کی جماعت اور اسے عشا کے ساتھ پڑھنے کی اجازت چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور ہم نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اس کے لیے ایک امام مقرر کر دیا ہے، اس وجہ سے اسے وہ بدعت قرار نہیں دیا جا سکتا جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضلالت قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: 'والتی ینامون عنها افضل من التی یقومون'[1] (جسے چھوڑ کر یہ سوئے رہتے ہیں، وہ اس سے افضل ہے جسے یہ پڑھ رہے ہیں)۔

روایت سے واضح ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نہ صرف یہ کہ لوگوں کے ساتھ اس نماز میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے رات کے آخری حصے میں اٹھ کر تنہا یہ نماز پڑھنے کو اس سے بہتر قرار دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، کبھی گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھی، لیکن صحابہ کے عمل سے اس کی اس سے زیادہ رکعتیں بھی ثابت ہیں۔ ان کا یہ عمل دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی اجازت یقیناً ان کے علم میں تھی، اس لیے کہ ہم ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی بدعت اختیار کر سکتے تھے۔ اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آ جاتی ہے۔ عام مسلمان جنھیں قرآن مجید زیادہ یاد نہیں تھا، رمضان کے مہینے میں زیادہ دیر تک قیام اللیل کی سعادت حاصل کرنے کے لیے غالباً اس اجازت کے طالب ہوئے کہ وہ رکعتوں کی تعداد بڑھا لیں اور آپ نے یہ اجازت دے دی۔ بعد میں جب ایک امام کا تقرر ہوا تو لوگ بالعموم تیئیس رکعتیں پڑھنے لگے۔

ہمارے نزدیک، عام مسلمان اگر چاہیں تو اسی ضرورت کے تحت جو اوپر بیان ہوئی ہے، اس سے زیادہ، مثلاً مالکیہ کی روایت کے مطابق انتالیس رکعتیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ تاہم اسے لازماً عشا کے ساتھ پڑھنے اور اس کی جماعت اور رکعتوں پر اصرار جیسی چیزوں کے لیے دین میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اکابر علما و صلحا کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمل کی پیروی میں اس نماز کی زیادہ سے زیادہ گیارہ رکعتیں پڑھیں اور اس کے لیے تہجد ہی کے وقت کو ترجیح دیں۔ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اس نماز کے پڑھنے والوں پر یہ حقیقت بھی واضح کرتے رہیں کہ یہ کوئی الگ نماز نہیں، بلکہ وہی تہجد کی نماز ہے جس کی اصل برکتیں سو کر اٹھنے کے بعد اور تنہا اپنے گھر میں اسے پڑھنے ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔

---

[1] بخاری، رقم ۲۰۱۵۔

منظور الحسن

لیلۃ القدر

اللہ تعالیٰ نے نظام زندگی کو شام و سحر، روز و شب اور ماہ و سال کے اعتبار سے تشکیل دیا ہے۔ یہ نظام اس کی عظیم حکمت کا آئینہ دار ہے۔ جہاں اس نے انسانوں کو ان اعتبارات کے لحاظ سے زندگی بسر کرنے کا شعور دیا ہے، وہاں اپنی قدرت، اپنی رحمت اور اپنی برکت کو اس دنیا سے متعلق کرنے کے لیے بھی انھی کو ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے لازمی عبادات کے خاص اوقات اور خاص ایام مقرر کیے ہیں اور بعض موقعوں کو اپنی عنایتوں کے حوالے سے نہایت اہم قرار دیا ہے۔ انھی میں سے ایک موقع ماہ رمضان اور اس کے اندر لیلۃ القدر ہے۔ لیلۃ القدر کو قرآن مجید نے مبارک رات سے تعبیر کیا ہے۔ اس رات کی برکت و فضیلت کے حوالے سے جو باتیں قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہیں، ان کا خلاصہ ہم یہاں بیان کر دیتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن مجید کا نزول

قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔'' (القدر ۹۷:۱)

''ہم نے اس (قرآن) کو ایک نہایت مبارک رات میں اتارا ہے۔'' (الدخان ۴۴:۳)

قرآن کے نزول سے اس رات کی نسبت معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم کے پروردگار نے انسانوں کو ابدی رہنمائی سے فیض یاب کرنے کے لیے اس رات کا انتخاب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا تھا کہ اس کا کلام نہایت محفوظ طریقے سے انسانوں تک پہنچے۔ چنانچہ اس نے ہر لحاظ سے اس کی حفاظت کا بندوبست فرمایا۔ اس ضمن میں اس نے آسمان سے زمین تک وہ تمام راستے مسدود کر دیے جن سے شیاطین دراندازی کر سکتے تھے۔

بہر حال قرآن مجید کی حفاظت کے اس عظیم انتظام کی بنا پر انسانوں کو قرآن جیسی عظیم نعمت ملنے کے ساتھ ساتھ یہ موقع بھی میسر آیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو شیاطین کی تاخت سے بچتے ہوئے اپنے پروردگار کے بے پایاں التفات سے فیض یاب ہوں اور جنت میں اپنے مقام کو محفوظ کر لیں۔

امور دنیا کی تقدیر و تقسیم

قرآن مجید نے اس رات کو لیلۃ القدر سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے مراد فیصلوں والی رات ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس موقع پر امور دنیا کے بارے میں اپنے فیصلوں کو متعین فرماتے اور ان کی روشنی میں کارکنان قضا و قدر کو ذمہ داریاں تفویض کرتے ہیں۔ سورۂ دخان میں ارشاد فرمایا ہے:

''اس رات میں تمام پر حکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے، خاص ہمارے حکم سے۔'' (۴۴:۴)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس کی یہ عظمت و برکت اس وجہ سے ہے کہ اس میں کائنات سے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔ جب اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے وہ دن بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے سال بھر کے منصوبے طے کرتی ہیں تو اس رات کی اہمیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس میں پوری کائنات کے لیے خدائی پروگرام طے ہوتا اور سارے جہان کا فیصلہ ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۴۶۷)

فرشتوں اور جبریل امین کا نزول بھی اسی پہلو سے ہے۔ فرمایا ہے:

''اس میں فرشتے اور روح الامین اترتے ہیں، ہر معاملے میں، اپنے پروردگار کی اجازت سے۔'' (القدر ۹۷:۴)

مراد یہ ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے امور کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اترتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ کے نہایت مقرب فرشتے حضرت جبریل امین بھی زمین پر اترتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.com

برکت اور سلامتی کی عظیم رات

سورۂ قدر میں اس رات کی عظمت و برکت کو دو پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک پہلو سے یہ بات بیان ہوئی ہے کہ: ''یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔'' معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب اس کی برکتوں اور فیض رسانیوں کی کثرت کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود انسانوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ یہ کوئی عام رات نہیں ہے کہ اسے سو کر گزار دیا جائے، بلکہ اگر پروردگار کے التفات اور نظر کرم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہزار مہینوں کی ہزاروں راتیں بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی اس آیت کی شرح میں لکھتے ہیں:

''ہزار مہینوں' ـــــــ کی تعبیر بیان کثرت کے لیے ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امور مہمہ کی تنفیذ کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے جو رحمتیں، برکتیں اور خدا سے قرب کے جو مواقع اس ایک رات میں حاصل ہوتے ہیں، وہ ہزاروں راتوں میں بھی نہیں ہو سکتے۔'' (البیان ۲۱۵)

دوسرے پہلو سے یہ فرمایا ہے کہ: ''یہ رات سراسر سلامتی ہے، طلوع فجر تک۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے دوران میں اللہ تعالیٰ آفات سماوی کو روک دیتے، شیطانوں کی کارروائیوں پر پابندی لگا

دیتے اور انسانوں کے لیے اپنے قرب اور اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ انھی برکات کے پیش نظر قرآن مجید نے اسے لیلۂ مبارکہ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

لیلۃ القدر کا تعین

قرآن مجید اور احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لیلۃ القدر ماہ رمضان ہی کی رات ہے، مگر یہ کون سی رات ہے، اس کی تصریح قرآن میں نہیں ہے۔ احادیث سے البتہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے۔ بخاری کی روایت کے مطابق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ بعض روایتوں میں آخری سات دنوں کی صراحت بھی ہے۔ بعض میں صحابۂ کرام کے حوالے سے اکیسویں، تیئسویں اور ستائیسویں رات کے بارے میں قیاسات نقل ہوئے ہیں، بعض میں اکیسویں، تئیسویں اور پچیسویں رات کا ذکر آیا ہے۔ تاہم اس موضوع کی تمام روایتوں پر نظر ڈالنے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ یہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کوئی طاق رات ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیلۃ القدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں۔ یعنی اکیس یا انتیس کو، تئیس یا ستائیس کو یا پچیس کو۔'' (بخاری)

لیلۃ القدر کی متعین تاریخ نہ بتانے کی حکمت بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کے اندر اس رات کو پانے کی جستجو پیدا ہو۔ اس جستجو میں وہ کئی راتیں عبادت میں گزاریں اور اپنے لیے اجر کا سامان پیدا کریں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عبادت کا اہتمام

لیلۃ القدر کی اس عظمت و برکت کو جاننے کے بعد یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گناہوں کی بخشش کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو بھی اس کی جستجو سے بے گانہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہر صاحب ایمان کو اپنے پروردگار کی بے پایاں نعمتوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور دل کی گہرائیوں سے اس کا شکر بجا لانا چاہیے۔ اپنی ضرورتوں اور تمناؤں کو اس کے حضور میں پیش کرنا چاہیے۔ اپنی پریشانیاں اس کے سامنے رکھ کر اس سے صبر کی توفیق طلب کرنی چاہیے اور ان کے تدارک کی درخواست پیش کرنی چاہیے۔ اس موقعے کا بہترین عمل عبادت ہے۔ روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں شب و روز کا بیشتر وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ سیدہ عائشہ بیان فرماتی ہیں:

''جب رمضان کی آخری دس تاریخیں آتی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر بستہ ہو جاتے تھے۔ رات رات بھر جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔'' (متفق علیہ)

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ: یٰمَرْیَمُ، اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ
عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۲﴾ یٰمَرْیَمُ، اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ، وَاسْجُدِیْ، وَارْکَعِیْ مَعَ
الرّٰکِعِیْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ واقعہ بھی اِنھیں یاد دلاؤ، جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا: اے مریم، اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا ہے اور پاکیزگی عطا فرمائی ہے[۸۳] اور دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر (اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے) منتخب کر لیا ہے[۸۴]۔ (اِس لیے) اے مریم، اب اپنے پروردگار کی فرماں برداری میں لگی رہو اور اُس کے حضور میں جھکنے والوں کے ساتھ رکوع و سجود کرتی رہو[۸۵]۔ ۴۲۔۴۳

[۸۳] یعنی لوگوں سے الگ کر کے تمھاری خاص تربیت کر دی ہے تاکہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تم اپنے آپ کو تیار کر لو۔

[۸۴] یعنی سیدنا مسیح علیہ السلام کی ولادت کے لیے منتخب کر لیا ہے جو بنی اسرائیل پر اتمام حجت کے لیے فی الواقع اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی بن کر آئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سیدہ مریم کے لیے یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ، وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ، وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

یہ[۸۶] غیب کی خبریں ہیں، (اے پیغمبر) جو ہم تمھیں وحی کر رہے ہیں، اور (حقیقت یہ ہے کہ) جب ہیکل کے خدام یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اُن میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے گا، اپنے اپنے قرعے ڈال رہے تھے تو تم اُس وقت اُن کے پاس موجود نہ تھے، اور نہ اُس وقت اُن کے پاس موجود تھے جب وہ (اِس معاملے میں) ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔[۸۷] ۴۴

---

[۸۵] اپنے پروردگار کی فرماں برداری میں لگے رہنے کی جو ہدایت اس سے پہلے ہوئی ہے، یہ اس کے اجمال کی تفصیل بھی ہے اور اس نماز باجماعت کی تصویر بھی جس کی سعادت سیدہ مریم کو ہیکل میں معتکف ہونے کی وجہ سے ہمہ وقت حاصل تھی۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ نماز کو یہاں رکوع و سجود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے اگر غور کیجیے تو استغراق وانہماک اور تبتل الی اللہ کی وہ کیفیت سامنے آتی ہے جو نماز کا اصلی حسن ہے۔ قرآن نے یہ اسلوب جگہ جگہ نماز کے اسی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

[۸۶] اثنائے کلام میں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے اور مقصود اس سے مخاطبین کو اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ وحی والہام کے بغیر آپ یہ واقعات اس صحت وصداقت کے ساتھ ہرگز نہیں سنا سکتے تھے، اس لیے کہ اہل کتاب کی تاریخ کا یہ حصہ بائیبل میں بھی تقریباً غائب ہی ہے۔

[۸۷] بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیکل میں ذمہ داریوں کا فیصلہ بالعموم قرعے ہی سے کیا جاتا تھا، لیکن اس موقع پر جھگڑے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ سیدہ مریم کے بارے میں قبولیت کے جو آثار پہلے دن سے نمایاں تھے، انھیں دیکھ کر ہیکل کے خدام میں سے کوئی بھی اس سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معز امجد

نماز کی پہلی صف میں شمولیت کی فضیلت

رُوی[1] أنه رأى رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی أصحابه تأخرا[2] فقال لهم: تقدموا فائتموا بی ولیأتم بکم من بعدکم[3]. لا یزال قوم[4] یتأخرونَ[5] حتی یؤخرهم اللّٰه[6].

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) اپنے بعض صحابہ میں (نماز کی پہلی صف میں شمولیت سے) گریز دیکھا تو آپ نے ان سے فرمایا: آگے (پہلی صف میں) آؤ، تم (نماز میں میرے پیچھے کھڑے ہوکر) میری پیروی کرو اور جو تمھارے بعد آئیں، انھیں چاہیے کہ وہ تمھاری پیروی کریں۔ (اور یاد رکھو) بعض لوگ (اسی طرح پہلی صف میں شمولیت سے) پیچھے ہٹتے رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ (اپنی عنایات کے معاملے میں) انھیں پیچھے کر دے گا۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ نماز کی پہلی صف میں شمولیت کی فضیلت اس باب کی دوسری روایات سے واضح ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فضیلت کو ایک اور پہلو سے بیان فرمایا ہے۔ آپ نے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ اگلی صفوں میں شمولیت سے مسلسل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اعراض کا رویہ آدمی کو خدا کے فضل، اس کی رحمتوں اور عنایات کے معاملے میں پیچھے لے جانے کا باعث بنتا ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ مسلم کی روایت، رقم ۴۳۸ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

ابن ماجہ، رقم ۹۷۸۔ ابوداؤد، رقم ۶۷۹۔ نسائی، رقم ۷۹۵۔ سنن الکبریٰ، رقم ۸۷۰۔ بیہقی، رقم ۴۹۷۸، ۴۹۷۹۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۱۱۵۸، ۱۱۳۱۰، ۱۱۵۲۹۔ ابویعلیٰ، رقم ۱۰۶۵، ۱۱۸۱۔ عبدالرزاق، رقم ۲۴۵۳۔ ابن حبان، رقم ۲۱۵۶۔ ابن خزیمہ، رقم ۱۵۶۰، ۱۶۱۲۔

۲۔ مسلم، رقم ۴۳۸ (۲) میں 'رأی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی أصحابہ تأخرا' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کے بارے میں محسوس کیا کہ وہ پیچھے رہنا چاہتے ہیں) کے بجائے 'رأی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قوما فی مؤخر المسجد' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو مسجد کی آخری صفوں میں دیکھا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۳۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۱۱۵۸ میں 'فائتموا بی ولیأتم بکم من بعدکم' (تو تم میری پیروی کرو اور جو تمھارے بعد آئیں انھیں چاہیے کہ وہ تمھاری پیروی کریں) کے بجائے 'ائتموا بی یأتم بکم من بعدکم' (تم میری پیروی کرو اور تمھارے بعد آنے والے تمھاری پیروی کریں گے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۴۔ بعض روایات مثلاً ابن خزیمہ، رقم ۱۶۱۲ میں 'لا یزال قوم' (بعض لوگ ایسا کرتے رہیں گے) کے بجائے 'لا یزال القوم' (یہ لوگ ایسا کرتے رہیں گے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۵۔ بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۶۷۹ میں 'یتأخرون' (پیچھے ہٹیں گے) کے ساتھ 'عن الصف الأول' (پہلی صف سے) کے الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں، جبکہ یہی مضمون بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۲۱۵۶ میں 'یتخلفون عن الصف الأول' (پہلی صف سے پیچھے رہیں گے) کے الفاظ میں اور ابویعلیٰ، رقم ۱۱۸۱ میں 'یتأخرون عنی' (مجھ سے پیچھے ہٹیں گے) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

۶۔ بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۲۱۵۶ میں 'یؤخرھم اللّٰہ' (اللہ انھیں پیچھے کر دے گا) کے بجائے 'یخلفھم اللّٰہ' (اللہ انھیں پیچھے چھوڑ دے گا) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں، جبکہ 'یؤخرھم اللّٰہ' (اللہ انھیں پیچھے کر دے گا) کے الفاظ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۱۳۱۰ میں 'یوم القیامۃ' (قیامت کے دن) کے اضافے کے ساتھ اور بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۶۷۹ میں 'فی النار' (آگ میں) کے اضافے کے ساتھ روایت ہوئے ہیں۔ نماز کی اگلی صفوں میں شمولیت جیسا

محض فضیلت کا عمل نہ کرنے پر آ گ میں ڈالے جانا چونکہ قرین قیاس نہیں ہے، اس لیے ہمارے نزدیک 'فی النار' (آ گ میں) کے الفاظ کا اضافہ کسی راوی کی طرف سے غالباً روایت کے ابہام کو دور کرنے کے لیے سہواً ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً ابن خزیمہ، رقم ۱۵۶۰ میں مذکورہ روایت اس طرح نقل ہوئی ہے:

دخل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم فرأی ناسا فی مؤخر المسجد فقال : ما یؤخرکم؟ لا یزال أقوام یتأخرون حتی یؤخرهم اللّٰه عز و جل . تقدموا . فأتموا بی ولیأتم بکم من بعدکم.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہوے تو بعض لوگوں کو وہاں آخر میں کھڑے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کیا چیز ہے جو تمھیں (پہلی صف میں شمولیت سے) پیچھے کرتی ہے؟ بعض لوگ اسی طرح پیچھے ہٹتے رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ (اپنی عنایت کرنے میں) انھیں پیچھے کر دے گا۔ چنانچہ تمھیں میرے پیچھے کھڑے ہونا چاہیے اور تمھارے بعد والوں کو چاہیے کہ وہ تمھارے پیچھے کھڑے ہوں۔''

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ: اظہار احمد

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

ہمارا دین

عن طلحة بن عبيد اللّٰه يقول جاء رجل إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من أهل نجد، ثائر الرأس، نسمع دوى صوته ولا نفقه ما يقول حتى دنا من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. فإذا هو يسأل عن الإسلام. فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: خمس صلوات فى اليوم والليلة. فقال: هل على غيرهن؟ قال: لا إلا أن تطوع. وصيام شهر رمضان. فقال هل على غيره؟ فقال: لا إلا أن تطوع وذكر له رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الزكوٰة. فقال: هل على غيرها؟ قال: لا إلا أن تطوع. قال: فأدبر الرجل وهو يقول: واللّٰه، لا أزيد على هذا ولا أنقص منه. فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أفلح إن صدق.

''حضرت طلحہ بن عبید اللہ روایت کرتے ہیں کہ اہل نجد[1] میں سے ایک شخص[2] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

---

[1] ایک رائے یہ ہے کہ یہ ضمام بن ثعلبہ ہیں جن کا تعلق بنی سعد بن بکر سے تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آیا۔ اس کے بال پراگندہ[3] تھے۔ ہم اس کی دھیمی دھیمی[4] آواز سن رہے تھے اور ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اسی اثنا میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ چنانچہ (اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے) آپ نے فرمایا: دن اور رات میں پانچ نمازیں[5]۔ اس پر اس نے پوچھا: ان کے علاوہ بھی کوئی نماز مجھ پر واجب ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، الّا یہ کہ تو خدا کی رضا کے لیے خود سے پڑھے[6]۔ (مزید) فرمایا: ماہ رمضان کے روزے۔ اس نے سوال کیا: ان کے علاوہ بھی کوئی روزے میرے اوپر فرض ہیں؟ آپ نے جواب دیا: نہیں، مگر یہ کہ تو اپنے رب کی خوشنودی کے لیے رمضان کے علاوہ بھی روزے رکھے۔ (اور اسی طرح) آپ نے زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا۔ (اس پر بھی) اس نے وضاحت چاہی: کیا اس کے علاوہ بھی کوئی انفاق مجھ پر لازم ہے؟ آپ نے کہا: نہیں، الّا یہ کہ تو خدا کی رضا کے لیے مزید خرچ کرے۔ (طلحہ) کہتے ہیں: (یہ سن کر) وہ شخص یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا: بخدا، نہ میں اس پر اضافہ کروں گا نہ میں اس میں کمی کروں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے سچ کر دکھایا تو یہ فلاح پا گیا[7]۔''

---

[2] یہ عرب کا ایک علاقہ ہے جو مکہ سے عراق کی جانب واقع ہے۔ لفظاً اس سے بلند جگہ مراد ہے۔

[3] اصل میں لفظ 'ثائر' ہے۔ یہ 'ثار یثور' سے اسم فاعل ہے۔ اس سے مراد اڑنا اور بکھرنا ہے۔ یہاں یہ بالوں کے پراگندہ ہونے کے مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔

[4] اصل میں لفظ 'دوی' ہے۔ جس کے معنی بھنبھناہٹ ہیں۔ یہاں اس سے آواز کا انتہائی نا قابل فہم ہونا مراد ہے۔

[5] اصل میں 'خمس صلوات' ہے۔ یہ مبتداے محذوف 'الاسلام' کی خبر ہے۔

[6] اصل میں لفظ 'تطوع' ہے۔ یہ باب تفعل سے واحد حاضر کا صیغہ ہے۔ جس سے ضمیر کی 'ت' حذف ہوگئی ہے۔ یعنی یہ اصل صورت میں 'تتطوع' ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تطوع سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی فرض سے سبک دوش ہو جانے کے بعد خدا کی خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مزید اس کو ایک نفلی نیکی کی حیثیت سے انجام دے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۳۸۷)

[7] اصل میں 'لا أزید علی هذا و لا أنقص منه' ہے۔ یہ متکلم کی طرف سے اس ارادے کا اظہار ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معنی

اس روایت کو حل کرنے میں ایک مشکل تو یہ ہے کہ اس میں ایمانیات اور ارکان میں سے حج کا ذکر نہیں ہے۔ اس روایت کے دوسرے متون سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے براہ راست نماز، روزے اور زکوٰۃ ہی کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس صورت میں راوی کا بیان کہ وہ اسلام کے بارے میں پوچھ رہا تھا خود راوی کا اپنا قیاس محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو پوچھا گیا تھا، آپ نے اسی کا جواب دیا ہے۔

دوسری مشکل آخری جملے 'لا أزيد على هذا و لا أنقص منه' کے مفہوم کے تعین میں ہے۔ اس جملے کا ایک مطلب تو یہ لیا گیا ہے کہ میں کسی بدعت کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ دوسرے معنی یہ قرار دیے گئے ہیں کہ میں نفلی عبادت نہیں کروں گا۔ اس کی تائید میں بخاری کی ایک روایت کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس روایت میں یہی جملہ[8]: 'لا أتطوع شيئا و لا أنقص مما فرض الله علي شيئا' کے الفاظ میں روایت ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ الفاظ راوی کا اپنا فہم ہیں۔ سائل کا منشا یہ نہیں ہے۔ تیسرے معنی یہ بیان کیے گئے ہیں کہ میں اس بات کا ابلاغ کرتے ہوئے کوئی کمی بیشی نہیں کروں گا۔ یہ تینوں معنی لینے میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ بدعت کے ارتکاب کی نفی ان الفاظ کا ایک اطلاقی پہلو ضرور ہے، لیکن متکلم کے الفاظ صرف اتنی بات کے لیے نہیں ہیں۔ نفل نہ پڑھنے کی بات اپنے اندر ایک منفی تاثر رکھتی ہے۔ چنانچہ اگر سائل کا مدعا یہی تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنے شان دار الفاظ میں تعریف اس بات سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ہمارے نزدیک سائل نے ان الفاظ سے اپنے پوری طرح عمل کرنے کے ارادے کو تعبیر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف کی ہے۔

ہم یہ بات اوپر بیان کر چکے ہیں کہ سوال پورے دین کے بارے میں نہیں تھا۔ روایت کے دروبست سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل دین کے احکام اور بنیادی تصورات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس کا سوال صرف یہ تھا کہ نماز، روزے اور زکوٰۃ کے معاملے میں دین کا اصل مطالبہ کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب سوال کے اسی رخ کو سامنے رکھ کر دیا ہے۔

اس روایت میں جن تین عبادات کا ذکر ہوا ہے، ان کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ اس روایت کا خصوصی پہلو 'تطوع' کا

کے ارشاد پر بے کم وکاست عمل کرے گا۔

8۔ بخاری، رقم ۱۷۹۲۔ ''میں نہ اپنی جانب سے بطور نفل کوئی عمل کروں گا اور نہ اس میں کوئی کمی کروں گا جو اللہ نے مجھ پر فرض کیا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیان ہے۔قرآن مجید میں حج اور روزے کے احکام بیان کرتے ہوئے نفلی عبادت کو اسی لفظ سے بیان کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:'فمن تطوع خیرا فإن اللّٰہ شاکر علیم'[9]۔اس آیۂ کریمہ سے نفلی عبادات کے اجر اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔بطور خاص 'شاکر علیم' کے الفاظ اپنے اندر ایک دل آویز تسلی کا سامان رکھتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے جذبۂ عبادت سے کس طرح خوش ہوتے ہیں۔شاکر کا لفظ اللہ کی رضا اور اجر کی فراوانی کے مفہوم پر متضمن ہے۔

متون

یہ روایت متعدد محدثین نے روایت کی ہے۔متن میں اختلافات دو طرح کے ہیں۔کچھ اختلافات محض لفظی ہیں۔مثلاً 'نسمع' کی جگہ 'یسمع' کا آنا یا 'افلح' کے بجائے 'دخل الجنة' کے الفاظ کا ہونا روایت کے معنی میں کوئی جوہری فرق پیدا نہیں کرتے۔لیکن دوسرا فرق کافی اہم ہے۔مندرجہ بالا متن سے معلوم ہوتا ہے کہ راوی کے خیال میں سائل نے اسلام کے بارے میں سوال کیا تھا اور جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز، زکوٰۃ اور روزے کا ذکر کیا ہے۔جبکہ بخاری، نسائی اور دارمی نے اس متن کے ساتھ ایک اور متن بھی روایت کیا ہے جس کے مطابق سائل نے براہ راست نماز، روزے اور زکوٰۃ ہی کے بارے میں پوچھا تھا۔اس سے نوعیت واقعہ میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر سوال اسلام کے بارے میں تھا تو جواب میں ایمانیات اور حج کا ذکر کیوں نہیں ہے۔بہر حال دونوں متون سامنے رکھیں تو یہ بات حتمی انداز میں کہنا مشکل ہے کہ اصل صورت واقعہ کیا ہے۔البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات سے یہ پہلو قوی معلوم ہوتا ہے کہ سوال براہ راست نماز، روزے اور زکوٰۃ ہی کے بارے میں کیا گیا تھا۔زیر بحث روایت کے راوی نے صرف یہ کیا ہے کہ اس مکالمے کو ایک جامع عنوان دے دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

بخاری، رقم ۴۶، ۱۷۹۲، ۲۵۳۲، ۶۵۵۶۔مسلم، رقم ۱۱۔نسائی، رقم ۴۵۸، ۲۰۹۰، ۵۰۲۸۔ابوداؤد، رقم ۳۹۱۔احمد، رقم ۱۳۹۰، ۱۳۸۴۲۔بیہقی، رقم ۱۵۷۲، ۲۰۵۷، ۲۴۳۵، ۴۲۳۷، ۶۹۲۷۔مسند احمد، رقم ۱۳۹۰، ۱۳۸۴۲۔موطا، رقم ۴۲۳۔ بیہقی، رقم ۱۵۷۲، ۲۰۵۷، ۴۲۳۵، ۴۲۳۷، ۶۹۲۷۔السنن الکبریٰ، رقم ۳۱۹، ۲۴۰۰، ۱۱۷۵۹۔ابن حبان، رقم ۱۷۲۴،

---

[9] البقرہ ۲:۱۵۸۔''جس نے اپنی جانب سے کوئی نیکی کا کام کیا تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔''

٣٢٦٢۔ابن خزیمہ، رقم ٣٠٦۔

— ١٢ —

عن أنس بن مالك قال نهينا أن نسأل رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن شىء. فكان يعجبنا أن يجىء الرجل من أهل البادية العاقل. فيسأله و نحن نسمع. فجاء رجل من أهل البادية. فقال: يا محمد، أتانا رسولك. فزعم لنا أنك تزعم أن اللّٰه أرسلك. قال: صدق . قال: فمن خلق السماء؟ قال: اللّٰه. قال: فمن خلق الأرض؟ قال: اللّٰه. قال: فمن نصب هذه الجبال و جعل فيها ما جعل؟ قال: اللّٰه. قال: فبالذى خلق السماء و خلق الأرض و نصب هذه الجبال، آللّٰه أرسلك؟ قال: نعم. وزعم رسولك أن علينا خمس صلوات فى يومنا و ليلتنا . قال: صدق. قال: وزعم رسولك أن علينا زكاة فى أموالنا . قال: صدق. قال: فبالذى أرسلك آللّٰه أمرك بهذا؟ قال: نعم. قال: وزعم رسولك أن علينا صوم شهر رمضان فى سنتنا . قال: صدق . قال: فبالذى أرسلك آللّٰه أمرك بهذا؟ قال: نعم . قال: وزعم رسولك أن علينا حج البيت من استطاع إليه سبيلا. قال: صدق. قال: ثم ولى. قال: والذى بعثك بالحق، لا أزيد عليهن ولا أنقص منهن . فقال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم : لئن صدق ليدخلن الجنة.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بھی چیز کے بارے میں سوال سے روک دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہمیں یہ بہت اچھا لگتا تھا کہ اہل دیہہ میں سے کوئی سمجھ دار آدمی آئے اور آپ سے سوال کرے اور ہم سن رہے ہوں۔ (انھی دنوں میں) اہل دیہہ میں سے ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: اے محمد، ہمارے پاس آپ کا نمائندہ[1] آیا ہے اور اس نے ہمیں یہ بتایا[2] ہے کہ آپ مدعی ہیں کہ اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے۔ اس نے پوچھا: آسمان کس نے بنایا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے۔ اس نے پوچھا: زمین کس نے بنائی ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے۔ اس نے پوچھا: یہ پہاڑ کس نے جمائے ہیں اور جو کچھ ان میں بنایا ہے، وہ بنایا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے۔ اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آسمان اور زمین بنائی اور یہ پہاڑ جمائے، کیا اللہ نے آپ کو رسول بنایا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: اور آپ کے نمائندے نے بتایا ہے کہ ہم پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے۔ اس نے کہا: اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو رسول بنایا ہے، کیا یہ بات آپ کو اللہ نے کہی ہے؟ آپ نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: آپ کے نمائندے نے بتایا ہے کہ ہم پر ہمارے اموال میں زکوٰۃ بھی واجب ہے۔ آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے۔ اس نے کہا: اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو رسول بنایا ہے، کیا یہ بات آپ کو اللہ نے کہی ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

---

[1] راوی نے لفظ 'رسول' بولا ہے۔ عربی میں یہ لفظ نمائندے، ایلچی اور پیغام بر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کا غالب استعمال اللہ کے پیغمبروں کے لیے ہے۔ اس وجہ سے ترجمے میں ہم نے حضور کے ایلچی (مقرر کردہ داعی) کے لیے نمائندے اور حضور کے لیے رسول کا لفظ لکھا ہے۔ جبکہ روایت میں دونوں جگہ ایک ہی لفظ آیا ہے۔

[2] اصل میں فعل 'زعم' آیا ہے۔ اس فعل کا عمومی استعمال متکلم کے اس خیال کے لیے ہوتا ہے جو حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ لیکن اس کے برعکس استعمال کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ یعنی اس کی نسبت متکلم کے اس بیان کی طرف بھی کی جاتی ہے جس میں متکلم پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ اردو میں فعل 'دعویٰ کرنا' اسی طرح متضاد مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ فعل حضرت جبریل کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح نحو کی کتابوں میں نحویوں کے اقوال کے لیے بھی یہ لفظ بے تکلف استعمال ہوتا ہے۔

آپ کے نمائندے نے کہا ہے کہ ہمیں ہر سال ماہ رمضان کے روزے رکھنے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے۔ اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے، کیا یہ بات آپ کو اللہ نے کہی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: آپ کے نمائندے نے بتایا ہے کہ ہمیں، جس کے پاس وسائل ہوں، بیت اللہ کا حج بھی کرنا ہے۔ آپ نے کہا: اس نے سچ کہا ہے۔ پھر وہ واپس چل دیا اور اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں نہ ان پر اضافہ کروں گا اور نہ ان میں کمی کروں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ اپنی بات میں سچا نکلا تو لازماً جنت میں جائے گا۔''

معنی

مفہوم و مدعا کے اعتبار سے یہ روایت اور سابقہ روایت ایک ہی مضمون کی حامل ہیں۔ دین اختیار کرتے ہی ایک آدمی پر جو عبادتیں فرض ہو جاتی ہیں، وہ یہی چار ہیں۔ ان صاحب نے بھی سارے مکالمے کے بعد وہی جملہ بولا ہے جو پچھلی روایت کے سائل نے بولا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی تصویب یہاں بھی نقل ہوئی ہے جو پچھلی روایت میں مذکور ہے۔ غرض یہ کہ یہ روایت مضمون کے اعتبار سے پچھلی روایت ہی کی تکرار ہے۔ البتہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی کا ایک ورق ہمارے سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے مختلف قبائل میں اپنے نمائندے بھیجے تھے جو انھیں دین سے آگاہ کرنے کا کام کرتے تھے۔ یہ صاحب اپنے علاقے میں رسول اللہ کے بھیجے ہوئے نمائندے سے سنی ہوئی باتوں کی تصویب ہی کے لیے مدینہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ گفتگو کی۔ ان صاحب کا انداز ذرا تیکھا ہے اور اس سے عرب کی بے تکلف طرز زندگی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ مزید برآں اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام عرب دین کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے حقائق کو کس سادہ منطق پر قبول کرتا ہے۔ سائل کے طرز گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اظہار مدعا کی مناسب لیاقت رکھتا ہے۔ بطور خاص اس نے قسم دینے میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں حسن ترتیب اس کے حسن بیان کا پتا دیتی ہے۔

نووی رحمہ اللہ نے یا محمد سے خطاب کو اس سائل کے قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تخاطب کے آداب سے بے خبری پر محمول کیا ہے۔ استاذ مکرم جناب غامدی صاحب کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد تھا اور محمد دادا کا دیا ہوا لقب تھا۔ عربوں میں بڑوں کو نام سے پکارنے میں بے ادبی سمجھی جاتی تھی اور ادب سے پکارنے کے طریقہ یہ تھا کہ لقب،

مرتبے یا کنیت سے پکارا جائے۔ اس اعتبار سے اس تخاطب میں کوئی حرج نہیں ہے۔

متون

پچھلی روایت کے سائل کے بارے میں ہم نے یہ لکھا تھا: ایک رائے یہ ہے کہ ضمام بن ثعلبہ ہیں اور ان کا تعلق بنوسعد بن بکر سے تھا۔ ہماری یہ بات شارح مشکوٰۃ ملا علی قاری رحمہ اللہ کے بیان سے ماخوذ تھی[۳]۔ زیر بحث روایت کی شرح میں یہی بات اس روایت کے سائل کے بارے میں شارح مسلم نووی رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ ساتھ ہی یہ تصریح بھی کی ہے کہ امام بخاری نے یہ روایت سائل کے نام کے ساتھ نقل کی ہے۔ بخاری کی اس روایت کا متن مسلم کی اس روایت سے بالکل مختلف ہے۔ بخاری کی اس روایت کی تمہید ملاحظہ ہو:

أنس بن مالك يقول بينما نحن جلوس مع النبي صلى اللّٰه عليه وسلم في المسجد. دخل رجل على جمل. فأناخه في المسجد. ثم عقله. ثم قال لهم: أيكم محمد، والنبي صلى اللّٰه عليه وسلم متكئ بين ظهرانيهم. فقلنا: هذا الرجل الأبيض المتكئ. فقال له: الرجل بن عبد المطلب. فقال له النبي صلى اللّٰه عليه وسلم:قد أجبتك. فقال الرجل للنبي صلى اللّٰه عليه وسلم: إني سائلك فمشدد عليك في المسألة. فلا تجد علي في نفسك. فقال: سل عما بدا لك. فقال: أسألك بربك ورب من قبلك، آللّٰه أرسلك إلى الناس كلهم. فقال: اللّٰهم نعم. قال: أنشدك باللّٰه. آللّٰه أمرك أن

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم مسجد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی اونٹ پر آیا۔ اس نے اس کو مسجد میں بٹھا دیا۔ پھر اسے باندھ دیا۔ پھر کہا: تم میں سے محمد کون ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بیچ میں ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا: یہ ٹیک لگائے ہوئے، گورا آدمی۔ اس نے آپ سے پوچھا: عبدالمطلب کا بیٹا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا: تمھیں جواب مل چکا ہے۔ اس آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں آپ سے سوال کرنے والا ہوں اور سوال کرنے میں کچھ سختی بھی کروں گا۔ میرے بارے میں دل میں سختی نہ لایے گا۔ آپ نے کہا: جو تمھارے خیال میں آیا ہے، پوچھو۔ اس نے کہا: میں آپ کو آپ کے رب اور آپ سے پہلوں کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔ آپ نے کہا: بالکل۔ اس نے کہا: میں

---

[۳] مرقاۃ ۸۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نصلي الصلوات الخمس في اليوم والليلة... (بخاری، رقم ۶۳)	آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم رات اور دن میں پانچ نمازیں پڑھیں..."

اسی انداز میں اس نے روزے، حج اور زکوٰۃ کے بارے میں پوچھا اور اپنی گفتگو کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا:

آمنت بما جئت به. وأنا رسول من ورائي من قومي وأنا ضمام بن ثعلبة أخو بني سعد بن بكر. (ایضاً)	"میں اس پر ایمان لایا جو آپ لے کر آئے ہیں۔ میں اپنی قوم کے لوگوں کا نمائندہ ہوں۔ میں بنی سعد بن بکر کا بھائی ضمام بن ثعلبہ ہوں۔"

بخاری کی یہ روایت اور مسلم کی روایت میں مضمون کی یکسانی کے باوجود بہت فرق ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ دو الگ الگ سائل ہیں۔ لیکن بالعموم شارحین کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں روایتیں ایک ہی ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو یہ دونوں روایتیں روایت بالمعنیٰ کے اس پہلو کو واضح کرتی ہیں کہ بسا اوقات راوی اصل الفاظ بالکل فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔ اس صورت میں پوری بات اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔

بہر حال اس روایت کے وہ متن جن میں الفاظ کا اتنا فرق نہیں ہے، ان میں بھی کچھ فرق موجود ہیں۔ مثلاً 'نهينا' کے ساتھ بعض روایات میں 'قد كنا' اور بعض میں 'في القرآن' روایت ہوا ہے۔ 'يجئ' کے بجائے 'ياتيه' آیا ہے۔ بعض روایات میں 'نسمعه' والا جملہ نہیں ہے۔ بعض روایات میں سائل کی قسم نقل نہیں ہوئی۔ مسلم کی روایت میں پہاڑوں کے ضمن 'جعل فيها ما جعل' کے الفاظ سے ان میں موجود نعمتوں کا ذکر ہوا ہے۔ بعض روایات میں منافع کا لفظ آیا ہے۔ غرض یہ کہ اس طرح کے متعدد چھوٹے چھوٹے فرق ہیں جن سے کوئی معنوی فرق واقع نہیں ہوتا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

نسائی، رقم ۲۰۹۱۔ احمد، رقم ۱۲۴۷۹، ۱۳۰۳۴۔ ابن حبان، رقم ۱۵۵۔ السنن الکبریٰ، رقم ۲۴۰۱، ۵۸۶۳۔ بیہقی، رقم ۸۳۹۴۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۱۲۸۵۔ ابویعلیٰ، رقم ۳۳۳۳۔ ترمذی، رقم ۶۱۹۔ دارمی، رقم ۶۵۰۔

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حج وعمرہ کے احکام یہی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعمل سے جو رہنمائی، البتہ ان کے بارے میں حاصل ہوئی ہے، اس کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

احرام

احرام باندھتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو لگاتے تھے۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے احرام سے پہلے بھی آپ کو مشک کی خوشبو لگائی ہے اور یوم النحر کو احرام کا لباس اتار دینے کے بعد بھی، جب آپ طواف کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ فرماتی ہیں کہ اس خوشبو کی چمک میں آپ کی مانگ میں گویا آج بھی دیکھ رہی ہوں۔[۴۱۷]

احرام کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے، بال جمائے اور سر بھی دھویا ہے۔[۴۱۸] نیز لوگوں کو اجازت دی ہے کہ ان کے پاس جوتے نہ ہوں تو اس مجبوری میں وہ ٹخنوں سے نیچے تک موزے کاٹ کر انھیں استعمال کر سکتے اور تہ بند کے طور پر باندھنے کے لیے ان سلا کپڑا نہ ہو تو شلوار یا پاجامہ بھی پہن سکتے ہیں۔[۴۱۹]

نکاح کرنے، کرانے یا نکاح کی بات طے کرنے کو، البتہ آپ نے احرام کی حالت میں پسند نہیں فرمایا۔[۴۲۰]

---

۴۱۷ بخاری، رقم ۱۵۳۸، ۱۵۳۹۔ مسلم، رقم ۱۱۹۰، ۱۱۹۱۔

۴۱۸ بخاری، رقم ۱۸۳۵، ۱۵۴۰، ۱۸۴۰۔ مسلم، رقم ۱۲۰۲، ۱۱۸۴، ۱۲۰۵۔

۴۱۹ بخاری، رقم ۸۴۲، ۸۴۳۔ مسلم، رقم ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹۔

اس حالت میں کوئی شخص دنیا سے رخصت ہو جائے تو آپ کا ارشاد ہے کہ اسے احرام کے کپڑوں ہی میں دفن کر دیا جائے اور تکفین کے موقع پر نہ اسے خوشبو لگائی جائے اور نہ اس کا سر اور منہ ڈھانپا جائے۔ فرمایا ہے کہ اللہ قیامت کے دن اس کو تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھائے گا۔[421]

اسی طرح وضاحت فرمائی ہے کہ احرام کی حالت میں شکار تو بے شک ممنوع ہے، لیکن احرام کے بغیر کسی شخص نے شکار کیا ہو تو محرم اسے کھا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے ایما یا کسی اشارے کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔[422] نیز فرمایا ہے کہ شکار کی ممانعت کے اس حکم کا موذی جانوروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح کے جانور حالت احرام میں بھی بغیر کسی تردد کے مارے جا سکتے ہیں۔[423]

تلبیہ

تلبیہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ حج کا شعار ہے[424] اور جب کوئی مسلمان 'لبیك لبیك' پکارتا ہے تو اس کے دائیں اور بائیں سے شجر و حجر بھی زمین کے آخر تک یہی پکارتے ہیں۔[425] چنانچہ فرمایا ہے کہ جبریل امین نے مجھے ہدایت کی ہے کہ اسے بلند آواز سے کہا جائے۔[426]

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ آپ اسی مفہوم کے بعض الفاظ کا اضافہ بھی کر دیتے تھے۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج و عمرہ کے لیے نکلتے تو ذوالحلیفہ پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھتے، پھر مسجد کے پاس اونٹنی پر سوار ہوتے، وہ کھڑی ہو جاتی تو تلبیہ کی ابتدا اس دعا سے کرتے تھے:

لَبَّيْكَ، اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ؛ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ ؛ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ ؛ لَبَّيْكَ وَالرَّغْبَاءُ إِلَيْكَ وَالْعَمَلُ.[427]

''میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں؛ حاضر ہوں اور اسی سے خوش بختی حاصل کرتا ہوں؛ اور بھلائی تیرے ہی ہاتھ

---

۴۲۰ مسلم، رقم ۱۴۰۹۔

۴۲۱ بخاری، رقم ۱۲۶۸۔ مسلم، رقم ۱۲۰۶۔

۴۲۲ بخاری، رقم ۱۸۲۴۔ مسلم، رقم ۱۱۹۶۔

۴۲۳ بخاری، رقم ۱۸۲۶، ۱۸۲۹۔ مسلم، رقم ۱۱۹۹۔

۴۲۴ ابن ماجہ، رقم ۲۹۲۳۔

۴۲۵ ابن ماجہ، رقم ۲۹۲۱۔

۴۲۶ ابوداؤد، رقم ۱۸۱۴۔

۴۲۷ مسلم، رقم ۱۱۸۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں ہے؛ حاضر ہوں اور رغبت تیری ہی طرف ہے اور عمل بھی تیرے ہی لیے ہے۔''

اسی طرح کے کسی موقع پر 'لَبَّیْکَ ، اِلٰہَ الْحَقِّ لَبَّیْکَ' کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔[428]

طواف

حج کا طواف تو ایک ہی ہے جسے اصطلاح میں طواف افاضہ کہا جاتا ہے، لیکن حج وعمرہ سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کے لیے رخصت ہونے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی ہے کہ جاتے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر کے جائیں۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: رخصت سے پہلے تم میں سے ہر ایک کا آخری کام یہی ہونا چاہیے۔[429] حائضہ عورتوں کو، البتہ آپ نے ان کی مجبوری کے پیش نظر اس کے لیے نہیں کہا، بلکہ اجازت دی کہ وہ اس کے بغیر ہی مکہ سے چلی جائیں۔[430]

طواف سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا ہے۔[431] آپ کا ارشاد ہے کہ یہ نماز ہی کی طرح ہے، لیکن اس کے دوران میں اگر کوئی بات کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ تاہم یہ بھلائی کی بات ہونی چاہیے۔[432]

سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ میں ایام سے تھی تو آپ نے فرمایا: تم اس حالت میں حج کے تمام مناسک ادا کر سکتی ہو، مگر طواف نہیں کر سکتی۔[433]

ام سلمہ کہتی ہیں کہ میں بیمار تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر ہوا تو آپ نے مجھے سواری پر طواف کر لینے کی ہدایت فرمائی۔[434]

جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ مکہ پہنچ کر آپ نے پہلا طواف کیا تو اس میں تین پھیرے کندھے ہلا کر دوڑتے ہوئے اور چار اپنی چال چلتے ہوئے لگائے۔[435] پھر مقام ابراہیم کی طرف بڑھے اور اس کے پیچھے جا کر دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد

428؎ ابن ماجہ، رقم ۲۹۲۰۔

429؎ مسلم، رقم ۱۳۲۷۔

430؎ بخاری، رقم ۳۲۸، ۳۲۹۔ مسلم، رقم ۱۲۱۱۔

431؎ بخاری، رقم ۱۶۱۴۔ مسلم، رقم ۱۲۳۵۔

432؎ ترمذی، رقم ۹۶۰۔

433؎ بخاری، رقم ۲۹۴۔ مسلم، رقم ۱۲۱۱۔

434؎ بخاری، رقم ۴۶۴۔ مسلم، رقم ۱۲۷۶۔

435؎ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ مسلمانوں کو مدینہ جا کر کمزور ہو جانے کا طعنہ دیا گیا تھا۔ رسول اللہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حجر اسود کی طرف واپس آئے، اس کا استلام کیا اور دروازے سے صفا کی طرف نکل گئے۔[436]

ابن عباس کا بیان ہے کہ اس طواف میں آپ کا دایاں کندھا برہنہ تھا اور اپنی چادر آپ نے داہنی بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالی ہوئی تھی۔[437]

طواف میں رکن یمانی کے استلام کا ذکر بھی بعض روایتوں میں ہوا ہے۔[438]

اسی طرح طواف کی یہ فضیلت بھی نقل ہوئی ہے کہ جس نے طواف کیا اور اس کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی، اس نے گویا ایک غلام اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔[439]

سعی

سعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی ہے کہ طواف سے فارغ ہو کر آپ صفا کی طرف نکلے اور اس کے اوپر تک چڑھ گئے، پھر قبلہ رو ہوئے، اللہ کی توحید اور کبریائی بیان کی اور فرمایا:

لا اله الا اللّٰه وحده، لاشريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شى قدير، لا اله الا اللّٰه وحده، انجز وعده، ونصر عبده، وهزم الاحزاب وحده.[440]

''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہی اسی کی ہے اور حمد بھی اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ تنہا ہے، اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اور اپنے بندے کی مدد کی ہے اور منکروں کی تمام جماعتوں کو تنہا شکست دے دی ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہی کلمات آپ نے تین مرتبہ دہرائے اور ان کے درمیان میں دعا بھی کی۔ اس کے بعد مروہ کی طرف چلے۔ جب قدم نشیب میں پہنچے تو دوڑنے لگے۔ پھر جیسے ہی چڑھائی شروع ہوئی، اپنی چال چلنے لگے۔ مروہ پر پہنچ کر بھی آپ نے وہی کیا جو صفا پر کیا تھا اور اپنے سات پھیرے اسی طرح پورے کر لیے۔[441]

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ اس طرح دوڑتے ہوئے طواف کریں اور خود بھی اسی طریقہ سے طواف کیا۔

436 مسلم، رقم ۱۲۱۸۔

437 ابوداؤد، رقم ۱۸۸۴، ۱۸۸۹۔

438 بخاری، رقم ۱۶۰۶، ۱۶۰۹۔ مسلم، رقم ۱۲۶۷، ۱۲۶۸۔

439 ابن ماجہ، رقم ۲۹۵۶۔

440 مسلم، رقم ۱۲۱۸۔

441 مسلم، رقم ۱۲۱۸۔

عرفات کا وقوف

منیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۹/ ذوالحجہ کی صبح طلوع آفتاب کے بعد عرفات کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں آپ کے لیے وادی نمرہ میں خیمہ لگایا گیا تھا۔ سورج ڈھلنے تک آپ نے اس میں قیام فرمایا۔ پھر وادی کے نشیب میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا۔ اس کے بعد ظہر اور عصر کی نماز ایک اذان اور دو تکبیروں کے ساتھ پڑھی۔ ان کے آگے اور پیچھے کوئی نوافل نہیں پڑھے۔ پھر جبل رحمت کے پاس قبلہ رو ہو کر غروب آفتاب تک کھڑے دعا و مناجات کرتے رہے۔[۴۴۲] انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس دن لوگ تلبیہ بھی پڑھتے رہے اور تکبیریں بھی کہتے رہے، لیکن کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔[۴۴۳]

سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہوتے ہیں، فرشتوں کے روبرو ان پر فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کسی دن اپنے بندوں کو آگ سے رہائی نہیں دیتے۔[۴۴۴]

مزدلفہ کا قیام

مزدلفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب اور عشا کی نماز عرفات ہی کی طرح ایک اذان اور دو تکبیروں کے ساتھ پڑھی۔ پھر صبح تک آرام فرمایا اور اس دوران میں کوئی نوافل وغیرہ نہیں پڑھے۔ نماز فجر، البتہ ذرا سویرے ادا کی۔ اس کے بعد روشنی کے پوری طرح پھیل جانے تک مشعر الحرام کے پاس کھڑے دعا و مناجات کرتے رہے۔ طلوع آفتاب سے کچھ پہلے آپ یہاں سے روانہ ہوئے اور وادی محسر سے تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے منیٰ پہنچ گئے۔[۴۴۵]

رمی

رمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن چاشت کے وقت اور بعد کے دنوں میں سورج ڈھلنے کے بعد کی ہے۔[۴۴۶] اس کے لیے آپ جمرے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوئے۔ بیت الحرام آپ کے بائیں جانب اور منیٰ دائیں جانب تھا۔ پھر آپ نے سات کنکریاں ماریں اور مارتے وقت ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔ پہلے دو جمروں کے پاس آپ نے وقوف بھی فرمایا اور رمی کے بعد قبلہ رو ہو کر دیر تک تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل اور دعا و مناجات کرتے رہے۔ جمرۂ عقبہ کے

۴۴۲؎ مسلم، رقم ۱۲۱۸۔

۴۴۳؎ بخاری، رقم ۹۷۰۔ مسلم، رقم ۱۲۸۵۔

۴۴۴؎ مسلم، رقم ۱۳۴۸۔

۴۴۵؎ مسلم، رقم ۱۲۱۸۔

۴۴۶؎ بخاری، رقم ۱۷۴۶۔ مسلم، رقم ۱۲۹۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پاس، البتہ آپ بالکل نہیں ٹھیرے۔[۴۴۷]

اس موقع پر اور اس سے پہلے بھی جب ۸/ ذوالحجہ کو آپ مکہ سے منیٰ آئے تو جتنے دن قیام فرمایا، اس کے دوران میں تمام نمازیں قصر کر کے پڑھتے رہے۔[۴۴۸]

علاقے کے بعض چرواہوں نے رات منیٰ میں گزارنے کے بجائے اپنے ریوڑوں کے پاس چلے جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دے دی اور فرمایا: یوم النحر کو کنکریاں مارنے کے بعد باقی دو دن کی کنکریاں ایک ہی دن مار لینا۔[۴۴۹]

قربانی

قربانی عام طریقے سے ہوئی، تاہم ایک اہم سوال اس کے بارے میں بھی پیدا ہوا کہ ہدی کے جانور اگر راستے ہی میں مرنے کے قریب پہنچ جائیں تو کیا کیا جائے؟ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے، جسے آپ نے قربانی کے اونٹ دے کر بھیجا تھا، پوچھا تو آپ نے فرمایا: ذبح کر کے ان کے نعل خون میں ڈبونا اور کوہان کے قریب رکھ دینا،[۴۵۰] پھر ان کا گوشت نہ تم کھانا اور نہ تمھارے ساتھی کھائیں۔[۴۵۱]

حلق

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نے خود بھی حلق کرایا اور آپ کے بعض صحابہ نے بھی اسی کو ترجیح دی۔[۴۵۲] ابن عمر کی روایت ہے کہ سر منڈوانے والوں کے لیے آپ نے تین مرتبہ اور بال کٹوانے والوں کے لیے ایک مرتبہ دعا فرمائی۔[۴۵۳]

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ قصر کے مقابلے میں حلق کی فضیلت بہر حال زیادہ ہے۔

حج وعمرہ سے متعلق چند باتیں ان کے علاوہ بھی روایتوں میں نقل ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ ایک عورت نے اپنا بچہ آپ کی طرف اٹھایا اور پوچھا: کیا یہ بھی حج کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، لیکن اس کا

---

۴۴۷ بخاری، رقم ۱۷۴۸، ۱۷۵۰، ۱۷۵۱، ۱۷۵۳۔ مسلم، رقم ۱۲۱۸، ۱۲۹۶۔

۴۴۸ بخاری، رقم ۱۶۵۵، ۱۶۵۶۔

۴۴۹ ابوداؤد، رقم ۱۹۷۶۔

۴۵۰ یہ اس لیے فرمایا کہ بعد میں آنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ مردار نہیں، بلکہ قربانی کا گوشت ہے۔

۴۵۱ مسلم، رقم ۱۳۲۵۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہی پسند فرمایا کہ اس طرح کے جانوروں کا تمام گوشت صدقہ کر دیا جائے۔

۴۵۲ بخاری، رقم ۱۷۲۹۔ مسلم، رقم ۱۳۰۱۔

۴۵۳ بخاری، رقم ۱۷۲۷۔ مسلم، رقم ۱۳۰۳۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اجر تمھارے لیے ہے۔[454]

دوسری یہ کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے پوچھا: یارسول اللہ، میرے باپ پر حج فرض ہے، مگر وہ اتنا بوڑھا ہے کہ سواری پر ٹھیر بھی نہیں سکتا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: کر سکتی ہو۔[455]

تیسری یہ کہ جہینہ کی ایک عورت نے حضور سے پوچھا: میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی، اب وہ دنیا سے رخصت ہو گئی ہے، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ضرور کرو، کیا اس پر قرض ہوتا تو تم ادا کرتیں؟ یہ اللہ کا قرض ہے، اسے بھی ادا کرو، اس لیے کہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے۔[456]

چوتھی یہ کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے 'لبیك عن شبرمة' کہا۔ آپ نے پوچھا: یہ شبرمہ کون ہے؟ اس نے کہا: میرا بھائی ہے۔ آپ نے پوچھا: اپنا حج کر چکے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا: پہلے اپنا حج کر لو، اس کے بعد شبرمہ کی طرف سے کر لینا۔[457]

پانچویں یہ کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور منیٰ میں لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو کسی نے پوچھا: مجھے معلوم نہ تھا، میں نے قربانی سے پہلے بال منڈوا لیے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اب قربانی کر لو، کوئی حرج نہیں۔ کسی نے پوچھا: مجھے معلوم نہ تھا، میں نے رمی سے پہلے قربانی کر لی ہے؟ آپ نے فرمایا: اب رمی کر لو، کوئی حرج نہیں۔ غرض یہ کہ کسی بھی چیز کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے یہی کہا کہ اب کر لو، کوئی حرج نہیں۔[458]

چھٹی یہ کہ حرم مدینہ کے بارے میں آپ نے لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح مکہ کو حرام ٹھیرایا ہے، میں نے اسی طرح مدینہ کو حرام ٹھیرایا ہے۔ لہٰذا اس کے دونوں کناروں کے درمیان میں کوئی شخص نہ کسی کا خون بہائے، نہ شکار کرے، نہ قتال کے لیے ہتھیار اٹھائے اور نہ کسی درخت کے پتے جھاڑے، الاّ یہ کہ جانوروں کو کھلانا پیش نظر ہو۔[459]

اسی طرح فرمایا کہ جس نے مدینہ میں کوئی بدعت پیدا کی یا بدعت پیدا کرنے والوں کو جگہ دی، اس پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔[460]

---

[454] مسلم، رقم ۱۳۳۶۔

[455] بخاری، رقم ۱۵۱۳۔ مسلم، رقم ۱۳۳۴۔

[456] بخاری، رقم ۱۸۵۲۔

[457] ابوداؤد، رقم ۱۸۱۱۔

[458] بخاری، رقم ۱۷۳۴، ۱۷۳۵۔ مسلم، رقم ۱۳۰۶، ۱۳۰۷۔

[459] بخاری، رقم ۱۸۶۹۔ مسلم، رقم ۱۳۶۲، ۱۳۷۴۔

ساتویں یہ کہ اپنی مسجد میں نماز کو آپ نے بیت الحرام کے سوا باقی سب مسجدوں میں ہزار نمازوں سے بہتر قرار دیا،[461] اور اپنے گھر اور منبر کے درمیان کی جگہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر ٹھیک اس مقام پر ہے، جہاں قیامت میں میرا حوض ہوگا۔[462]

[باقی]

۴۶۰؎ بخاری، رقم ۱۸۶۷۔ مسلم، رقم ۱۳۶۶۔

۴۶۱؎ بخاری، رقم ۱۱۹۰۔ مسلم، رقم ۱۳۹۴۔

۴۶۲؎ بخاری، رقم ۱۱۹۶۔ مسلم، رقم ۱۳۹۱۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ساجد حمید

صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟

چند اہم باتیں

نیکی کے شعبے

واضح رہے کہ ایمان کی طرح ہر وصف اور ہر نیکی کے شعبے ہوتے ہیں۔ مثلاً توکل کے بھی شعبے ہیں، بعض لوگ خدا کی طرف سے آنے والے امتحانات میں تو توکل پر قائم رہ پاتے ہیں، مگر انسانوں کی طرف سے آنے والے مصائب پر وہ ایسا نہیں کر پاتے اور خدا کے توکل کو بھول کر انتقام لینے نکل پڑتے ہیں اور بعض اس کے برعکس لوگوں کے ساتھ تو معاملات بخوبی نبھاتے ہیں، مگر سماوی تکالیف میں وہ خدا سے نالاں ہوتے یا مایوس ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک ایسا ہی مسئلہ صبر میں ہے۔ آدمی بعض پہلوؤں میں بہت اچھا صابر ہوگا اور بعض میں وہ نہایت بے صبرا۔ کہیں غصے میں بھڑک اٹھے گا اور کہیں نہایت صبر و حوصلے کے ساتھ شاہ راہ حیات پر گام زن ہوگا۔ ہر آدمی کو ان اوصاف میں کامل ہونے کی سعی کرنی ہے۔

دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ وہ مکمل معنی میں غیر صابر ہو۔ وہ کہیں نہ کہیں صبر کر رہا ہوتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنا جائزہ لے اور اپنے آپ کو کامل معنی میں صابر بنائے۔

ہم کمرۂ امتحان میں ہیں

ہم سب آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ہم چوبیس گھنٹے اس یاد میں رہیں کہ ہم امتحان دینے آئے ہیں۔ ہماری حالت اس طالب علم کی سی ہے جو کمرۂ امتحان میں بیٹھا ہے۔ جس کی ساری توجہ اپنے پرچے پر ہے۔ اس کی توجہ ان چیزوں پر نہیں ہوتی کہ اس کا کمرہ صحیح ہے یا نہیں، جس میز پر وہ بیٹھا ہے، اس کا خیال اس کی تعمیر و رعنائی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کی سر تا سر کوشش یہی ہوتی ہے کہ بس امتحان دے اور فارغ ہو چکے۔ وہ ہمہ وقت اس میں مگن ہے کہ

کسی نہ کسی طرح پرچہ اچھا ہو جائے۔ کسی کی نقل کرکے، کسی سے پوچھ کر، بھولی ہوئی بات یاد کرکے سوال کا جواب پورا دے دے۔ ہر لمحہ وہ اسی کوشش میں ہوتا ہے کہ اس کا پرچہ صحیح حل ہو جائے۔

جو آدمی اپنے امتحان میں یوں مگن ہو جائے تو وہ بس اپنے بینچ اور میز کی اتنی ہی فکر کرے گا جس پر وہ بیٹھ کر امتحان دے سکے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ یہی حالت ہماری اس کمرۂ امتحان میں ہے جس میں ہم ساٹھ ستر یا اس سے کم یا زیادہ برسوں کے لیے ڈال دیے جاتے ہیں، لیکن چونکہ ہم اس امتحان میں نسل در نسل ڈالے گئے ہیں۔ ایک کے بعد ایک تو ایسا لگتا ہے کہ کمرۂ امتحان ہی میں ترکھان نے دکان کھول لی ہے۔ اور وہ ہر طالب علم کی خواہش کے مطابق میز اور بینچیں بنانے لگا ہے۔ چنانچہ اب پرچے کے بجائے بینچ اور میز کی رعنائی پر توجہ ہوگئی ہے۔ پرچہ ممتحن کے ہاتھ میں دھرے کا دھرا رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بینچوں اور میزوں کا مقابلہ شروع ہو گیا ہے اور امتحان کی جانب کسی کو توجہ نہیں ہے۔ اگر امتحان کی جانب توجہ ہوتی تو ٹوٹی میز اور ہلتی ہوئی بینچ بھی کافی تھی، مگر اب اس سے توجہ اٹھ گئی ہے، اس لیے میزوں میں مقابلہ ہو گیا ہے۔ جس میں غصہ بھی آ رہا ہے اور بے صبری بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ آپا دھاپی کا سماں ہے۔ حسن و رعنائی کے مقابلے ہیں اور امتحان کی کھٹک سی سینے میں ہے۔ میزوں میں مقابلہ ہارتے ہیں تو سیخ پا ہو جاتے ہیں، اور چھینا جھپٹی جاری ہو گئی ہے۔

یہی آج کی دنیا کے انسان کی حقیقت ہے کہ وہ کمرۂ امتحان میں ہے، مگر سمجھتا ہے کہ اس سے باہر ہے۔ اگر وہ دوبارہ کمرۂ امتحان میں آ جائے تو اسے نہ غم ستائیں گے، اور نہ مادیت میں دوسروں کی ترقی اور نہ اپنی کم مائیگی۔ اگر کوئی چیز اسے ستائے گی تو یہی کہ اس کا پرچہ صحیح حل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر پرچہ صحیح حل نہیں ہو رہا تو میز کی خوب صورتی اسے کھلنے لگے گی۔ بینچ کی نرمی اس کے لیے تکلیف دہ ہو جائے گی۔

اس تمثیل کو ہم نے اس لیے بیان کیا ہے کہ آپ پر یہ حقیقت واضح ہو کہ آخرت کا ایمان آدمی میں کیا نظر اور زاویۂ نگاہ پیدا کرتا ہے اور اس سے گریز اور دوری کیا مسائل پیدا کرتی ہے۔ یعنی جب آدمی راستے کو منزل سمجھ لے اور گزرگاہ کو گھر بنا لے تو اس سے کیا مسائل پیدا ہوں گے۔ ایک تو وہ منزل کھوٹی کر لے گا اور دوسرے اس دنیا میں ایک تکلیف سے بھرپور قسم کی کیفیت میں مبتلا رہے گا جو اس سے ہر طرح کے اعلیٰ اوصاف کو آہستہ آہستہ چھین لے گی۔ جن میں صبر سب سے بڑا وصف ہے۔

نیکی کے اسباب

نیکی کے اسباب دنیوی بھی ہوتے ہیں اور دینی بھی۔ ہمیں حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے محرکات اور اسباب دینی ہو جائیں۔ مثلاً صبر ہی میں دیکھیں تو کبھی ہم اپنے بچوں کے محض پیار اور شفقت کے پیش نظر ان کی غلطیوں پر صبر کر لیتے ہیں اور ان کی برائی سے صرف نظر کرتے ہیں، مگر اسے دینی بنا لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پیار اور محبت کے ساتھ ساتھ اسے خدا کی رضا جوئی کے لیے ایسا کریں، پھر ہم محض صرف نظر نہیں کریں گے اور شفقت دکھا کر نہیں رہ جائیں گے، بلکہ ان کی خیر خواہی میں ان کی اصلاح کی بھی کوشش کریں گے۔ ان کے دنیوی مستقبل ہی پر نہیں اخروی مستقبل پر بھی ہماری نگاہ ہوگی۔ اور

یہ صبر پھر محض ایک باپ یا ماں کا عمل بن کر نہیں رہ جائے گا، بلکہ ایک بندۂ مؤمن کا عمل خیر بن جائے گا۔ جس سے خود اس کی اپنی تربیت بھی ہوگی اور اس کو اجر بھی ملے گا۔

باب ۱

صبر کیا ہے؟

صبر کے معنی

عربی زبان کے اس لفظ کو اگر ہم قرآن مجید اور عربی ادب کے استعمالات کی رو سے دیکھیں تو اس کے بنیادی معنی 'رکے رہنے' یا 'روکنے' کے ہیں۔ پھر یہ لفظ وسعت پا کر ثابت قدمی اور استقامت کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور اب یہ زیادہ تر اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ثابت قدمی اپنے ''موقف'' پر ہوتی ہے۔ یہ ''موقف'' میدان جنگ بھی ہو سکتا ہے اور اعلیٰ اوصاف و اخلاق بھی۔ یعنی آدمی ہر حالت میں اپنے اچھے ''موقف'' پر ڈٹا رہے تو یہ صبر ہے۔ صبر میں غلط چیزوں پر ڈٹے رہنے کا مفہوم داخل نہیں ہے۔ اس لیے صبر کا لفظ ہمیشہ مثبت معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اپنے حقیقی یا لغوی معنی (روکنے) میں یہ منفی پہلو سے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ صبر مشکلات میں رونے دھونے اور چیخنے چلانے کے متضاد معنی میں بھی آتا ہے، لیکن بنظر غائر دیکھیں تو اس کے معنی بھی وہی ہیں۔ یعنی رونا دھونا حوصلہ مندی جیسے اعلیٰ وصف پر قائم نہ رہنے کا نام ہے۔ چنانچہ جب ہم چیخنے چلانے والے سے یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ صبر کرو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حوصلہ مندی پر قائم رہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عرب صبر کی جگہ 'تجمل' کا لفظ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ یعنی وہ رونے دھونے والے سے کہتے ہیں کہ 'تجمل' بھلا کام کرو یعنی صبر کرو اور کمزوری ظاہر نہ ہونے دو، وغیرہ۔ امرؤالقیس کا شعر ہے:

وقوفًا بها صحبي عليَّ مطيَّهم

يقولون: لا تهلك أسىً و تجمَّلِ

''ببول کے درختوں کے پاس مجھ پر میرے دوست اپنی سواریاں روکے کہہ رہے تھے، غم سے خود کو ہلاک نہ کرو، بھلے بنو (یعنی کمزوری نہ دکھاؤ، صبر کرو)۔''

اسی طرح بعد میں صبر کے ساتھ جمیل کا اضافہ ہونے لگا۔ جس میں احسان اور نیکی کے معنی ہوتے ہیں۔ اس طرح صبر جمیل ان مواقع پر استعمال ہونے لگا، جہاں صبر سے بڑھ کر مزید کسی حسن سلوک اور نیکی کی بھی ضرورت ہو۔ جیسے قصۂ یوسف میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال آئے، اور آ کر ان سے جھوٹ کہانی کہہ سنائی تو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انھوں نے جواب میں فرمایا: 'بل سولت لکم انفسکم امرا، فصبر جمیل و اللّٰہ مستعان علی ما تصفون ' یعنی ایک طرف سیدنا یوسف کے کھونے کا دکھ ہے اور دوسری طرف برادران یوسف کی دھوکا دہی کا غم وغصہ۔ چنانچہ ایک طرف غم یوسف سے نبرد آزما ہونے کے لیے حوصلہ چاہیے اور دوسری طرف برادران یوسف سے عفو و درگزر کے لیے صبر جمیل۔

صبر کا ایک اور رخ

ابھی تک ہم نے صبر کے ساتھ مشکلات ہی کا ذکر کیا ہے کہ صبر مشکلات میں ثابت قدمی کا نام ہے، مگر جس طرح مشکلات میں صبر کرنا پڑتا ہے، ایسے ہی انعامات کے وقت بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔ یعنی جس طرح مشکل کی وجہ سے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ آدمی اپنے موقف سے ہٹ جائے، اسی طرح نعمتیں بھی اس بات کا امکان پیدا کر دیتی ہیں کہ آدمی ان میں مگن ہو کر اپنے موقف سے ہٹ جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اگر ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں، پھر اس سے اس کو محروم کر دیتے ہیں، تو وہ مایوس و ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد، جو اس کو پہنچی اس کو نعمت سے نوازتے ہیں، تو کہتا ہے کہ میری مشکلات رفع ہوئیں، پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ اکڑنے والا اور شیخی بھگارنے والا بن جاتا ہے۔ اس سے صرف وہی بچے رہتے ہیں، جو صبر کرنے والے اور نیک اعمال کرنے والے ہیں، انھی کے لیے بڑی نجات اور اجر کبیر ہے۔'' (ہود ۱۱: ۹۔۱۱)

یہاں قرآن مجید نے نعمتیں چھننے پر مایوس ہونے اور نعمتیں ملنے پر اکڑنے اور تکبر کرنے کو خلاف صبر رویہ قرار دیا ہے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ صبر یہ بھی ہے کہ نعمتیں پا کر بھی آپے سے باہر نہ ہو۔ یہ صرف چیخنے چلانے یا رائے میں حق پرستی کا نام نہیں ہے، بلکہ صبر یہ بھی ہے کہ آدمی مشکلات میں پڑنے کے بعد عملی طور پر بھی صحیح موقف پر قائم رہے۔

ہم امتحان میں ہیں

اوپر کی بحث کا اگر خلاصہ کریں، تو پوری بات یہ ہے کہ صبر کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر حالت میں علم و عمل میں صحیح ''موقف'' پر قائم رہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صحیح ''موقف'' سے کیا مراد ہے؟

قرآن مجید نے سورۂ ملک کی پہلی آیات میں اس دنیا کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''بڑی ہی عظیم اور بافیض ہے، وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں (اس کائنات کی) بادشاہی ہے، اور جو ہر چیز پر قادر ہے۔ اس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ تمھارا امتحان کرے، کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا بنتا ہے۔ اور (اللہ) غالب بھی ہے اور مغفرت فرمانے والا بھی۔'' (الملک ۶۷: ۱۔۲)

اس آیت سے ہمیں یہ بات واضح الفاظ میں معلوم ہو رہی ہے کہ ہمیں یہ زندگی اس لیے دی گئی ہے کہ ہمارا امتحان لیا جائے اور اچھے عمل والوں کو جنت کے لیے چن لیا جائے۔ اس دنیا میں ہمارا اصل ''موقف'' یہی ہے۔ یعنی ہم ہر لمحہ امتحان میں ہیں۔

جب ہمیں کوئی نعمت ملے یا نہ ملے، جب کوئی آسانی آئے یا مشکل درپیش ہو تو ہر حالت میں ہمیں یہ بات پوری طرح ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہم امتحان میں ہیں۔ جس شخص کو یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے، اور وہ اسی نقطۂ نظر سے زندگی بسر کرنے لگ جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا ہے کہ اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے، اسے دین کی یہ سمجھ عطا کر دیتا ہے۔ (مسلم، رقم ۱۰۳۷)

اس موقف کے واضح ہو جانے کے بعد ہماری پوری بات کا مطلب یہ ہے کہ صبر کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر حالت میں امتحان دینے والے بن کر رہیں۔

قرآن مجید نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو اپنی زبان میں اس پوری بات کو سمجھا کر ہم پر واضح کر دیا ہے کہ صبر کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے:

''اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ بس ثابت قدموں کے ساتھ ہے، اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم محسوس نہیں کر سکتے۔ بے شک ہم تمھارا امتحان کریں گے۔ کسی قدر خوف، بھوک اور جان و مال میں کمی سے، اور ان صابروں کو یہ خوش خبری سنا دو، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں: 'انا للّٰہ و انا الیه راجعون' یعنی ہم اللہ ہی کے ہیں، اور (ایک دن) اسی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہی لوگ ہیں، جن پر تیرے رب کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں، اور یہی لوگ راہ یاب ہیں۔ (البقرہ ۲: ۱۵۳۔ ۱۵۷)

صحابہ کے لیے قرآن کا یہ مطالبہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ہمیں اس سے خدائی اسکیم اور اس آزمایش کی طرز، ذرائع اور مطلوب رویوں کا پتا چلتا ہے۔ اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ صبر بڑے سے بڑے موقع پر بھی چھوڑنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک اعلیٰ و محمود رویہ ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان'' میں تحریر فرماتے ہیں:

أن الصبر ربما يكون فعلا، ينشأ من شرافة النفس و إبائها، و رسوخ القدم في الطاعة و احتمال عظائم الأمور، و ربما يكون انفعالا و احتمالا للقهر و الظلم و هذا ادنى الصبر. (۲۳۶)

''صبر ایک ایسا عمل ہے جو کبھی اعلیٰ ظرفی، روح کی ابا اور بندگی میں راسخ القدمی سے پھوٹتا ہے۔ اور یہ بڑے کاموں کے تحمل کے حوصلہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ ظلم و جبر کے مقابلے میں محض منفعل مزاجی کی بنا پر سامنے آتا ہے۔ یہ دوسری صورت صبر کی گھٹیا شکل ہے''۔

صبر اور بدی کے بدلے نیکی

صبر کا ایک لازمی تقاضا قرآن مجید سے یہ سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم جب کسی کی طرف سے برائی سامنے آئے تو اسے نہ صرف برداشت کریں، بلکہ ان کی برائی کے بدلے نیکی سے جواب دیں۔ اگر ہم اس کے برعکس کریں گے تو یہ عمل صبر کے خلاف ہو گا۔ اس لیے کہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ صبر صرف یہ نہیں ہے کہ ہم چیخنے چلانے سے گریز کریں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور

کردار کی بلندی پر قائم رہیں۔ اور دوسرے اگر برائی کر رہے ہوں تو ہم ان کی نقل میں یا انتقام لینے میں برائی نہ کریں۔ بلکہ کوشش کریں کہ ہم لوگوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دیں۔ مزید یہ بات بھی قرآن سے معلوم ہوتی ہے کہ بسا اوقات ایسا کرنا اگر ممکن ہو تو اس موقع پر اپنے مقابل کے ساتھ نیکی کر کے اللہ کی راہ میں خیرات وغیرہ کرنی چاہیے:

اُوْلٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ بِمَا صَبَرُوْا وَ یَدْرَءُ وْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ، وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ. (القصص ۲۸: ۵۴)

''یہ لوگ ہیں کہ جنھیں دہرا اجر ملے گا، بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے، اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے، اور ہمارے دیے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں۔''

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلیفہ شجاع الدین

اسلام کا نظام تعلیم

یہ مضمون ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم کے ایک انگریزی خطاب کا ترجمہ ہے۔ یہ خطاب انھوں نے ۱۹۵۳ء میں پرنسٹن (امریکہ) میں ایک اجتماع سے کیا تھا۔ اس کے مترجم حاجی فضل احمد ہیں۔ ہم نے اسے ہفت روزہ ''حمایت اسلام'' کی ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء کی اشاعت سے منتخب کیا ہے۔ (ادارہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مقدمہ

کوئی طریقۂ تعلیم جو کسی جماعت و قوم میں رواج پکڑتا ہے، وہ اس کی اجتماعی زندگی کا نہایت اہم عنصر اور اس کی امتیازی حیثیات کا علم بردار ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اس کی ذہنی اور روحانی خصوصیات کا عکاس بھی ہوتا ہے، اس لیے کسی قوم کا روحانی و اخلاقی جائزہ لیتے وقت ہر محقق کے لیے لازمی ہے کہ اس کی تعلیمی نشو و نما اور ارتقا کا بھی جائزہ لے۔ اس امر کی افادیت اور قدر و قیمت یہاں تک ہی محدود نہیں رہتی کہ وہ اس قسم کی روحانی اور ذہنی صلاحیتوں کو ظاہر کرے جس کے ہاتھوں اس نے تربیت پائی، بلکہ اسی کے مستحکم ہو جانے پر اس کو معراج کمال تک پہنچانے کے لیے ہر مرحلہ پر زبردست ممد و معاون بھی ثابت ہوتا ہے اور اس طرح اس کے قابل تقلید خصائص اور نصب العین کے لیے ایک مستقل اور دوامی صورت اختیار کرنے میں امداد دیتا ہے۔

موجودہ دور میں جبکہ تمام اسلامی ممالک کا طریقۂ تعلیم کم و بیش سرعت کے ساتھ انقلاب پزیر ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرتے وقت نہایت صحیح اور فلسفیانہ انداز فکر اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔

تعلیمی تصور، نصب العین اور مقصد

''تعلیم زندگی کا ایک جز ولاینفک ہے۔'' اس مقولہ کی اہمیت کا کما حقہ اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس معاملے کو

تعلیمی مسئلہ میں دلچسپی لینے والے حضرات کے سامنے رکھا جائے۔ عوام کے جماعتی نظام کے لیے کامیاب حکومت ترتیب دینے میں تعلیم کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد صالح انسان اور شریف شہری تیار کرنا ہے۔ ایک نصب العین کے مطابق، اپنی آیندہ نسلوں کی تشکیل میں کسی جماعت کے بالغ افراد کی جدوجہد کو تعلیم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ''جے ایس مل'' تعلیم کے تحت ہر ایسی چیز کو شامل کرتا ہے جو انسانی صورت کی تکمیل کے لیے مددگار ہوتی ہے۔ ''لاک''، تعلیم کا مفہوم ادا کرنے کے لیے اسے ایک تندرست جسم میں نیک روح سے تشبیہ دیتا ہے اور یہ مفہوم مہذب انسانی طبقہ میں نیک عادات، دانائی اور حکمت کی تعلیم سے پورا ہو سکتا ہے۔ جس سے معاشرے کے افراد عام امور کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے قابل بن جائیں۔ نری افزایش نسل اور محض تعلیم کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ''لاک'' امام غزالی کے نقش قدم پر چل کر اخلاق، بلکہ دینی تعلیم کو اصل الاصول کا رتبہ دیتا ہے۔ امام صاحب گیارہویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں ایسی تعلیم کو مردود قرار دے چکے ہیں جس سے اخلاقی و دینی شعور کی بیداری مقصود نہ ہو۔ ''ہربرٹ سپنسر'' کے نزدیک تعلیم کا مقصد کسی فرد کو مکمل زندگی کے لیے تیار کرنا ہے۔ یہ اسناد اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہوں گے کہ کسی طریقۂ تعلیم کو اس وقت تک معقول و کامیاب نہیں کہا جا سکتا، جب تک کہ وہ قوم کی اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی ضروریات کا بدرجہ اتم کفیل نہ بن سکے۔

یہ مسئلہ بحث طلب اور پیچیدہ ہے کہ آیا تعلیم بذات خود کوئی مقصد ہے یا کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ اور کیا مقاصد، اجزا اور طریقۂ تعلیم کی تمام اصناف پر محیط ہے۔ اطمینان قلب اور ذہنی تسکین کے لیے، تعلیم کو بذات خود مقصد قرار دینا ایک ارفع و اعلیٰ ترین نصب العین تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن اس اعلیٰ و ارفع خیال کے حامل بہت کم ہیں اور تعلیم کو عوام کے لیے کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار دینا ہی عام فہم تصور کیا جاتا ہے۔

ایک نوخیز بچے کے حافظہ میں چند بے ربط امور کے ٹھونس دینے کا نام تعلیم نہیں ہے، کیونکہ اس سے کسی آزاد قوم کے تمام لوازمات زندگی فراہم نہیں ہو سکتے۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

اسلام نے عرب میں صرف وہ طریقۂ تعلیم ہی جاری نہیں کیا جس سے قبل اسلام اہل عرب بے بہرہ تھے، بلکہ انھیں تہذیب و تمدن کے اعلیٰ علیین تک پہنچا دیا۔ قرآن حکیم بذات خود علم و حکمت کی اعلیٰ اقدار کا شاہد ناطق ہے۔ عرب قوم میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ باوجودیکہ خود رسول کریم بھی پڑھنا لکھنا نہ جانتے تھے، لیکن وحی کے اولین خطاب میں جو بات انھیں سب سے پہلے ارشاد فرمائی گئی، وہ یہ تھی کہ ''پڑھیے'' اس کے بعد موقع بموقع حصول علم کے ذرائع و مقاصد کی سیر حاصل تشریح ہوتی رہی۔ انسانی ہستی کی ابتدا، جو قابل ذکر شے سے خطاب ہوئی۔ اس کے مختلف مدارج، تحصیل علم کے لیے اس کی جدوجہد ـــــ اور اس کے مقابلہ میں باری تعالیٰ کی طرف سے انعامات کی بارش، اسی کریمی ذات (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے دنیا تک پہنچی۔ علم کے بارہ میں رسول کریم کے ارشادات، احادیث میں موجود ہیں چنانچہ طلب علم میں چین تک جانے کی تلقین

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمائی اور حصول علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت کا مذہبی فریضہ قرار دیا۔ اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مندرجہ ذیل مقولہ نہایت جامع اور واضح ہے، کیونکہ یہ ارشاد گرامی نہ صرف ہر مسلمان کے لیے تحصیل علم لازمی ہی قرار دیتا ہے، بلکہ اس کی سر بستہ حکمتوں سے بھی روشناس کرا دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

''علم حاصل کرو، کیونکہ جو اس میں کوشاں ہوتا ہے، وہ راہ خدا کی سعادت مندی سے بہرہ اندوز ہوتا ہے جو اسے بیان کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کہتا ہے۔ جو اسے تلاش کرتا ہے، وہ معبود برحق کی عبادت کرتا ہے۔ جو اس کا درس دیتا ہے، وہ خیرات کرتا ہے، جو اس کی تبلیغ کرتا ہے، وہ گویا زہد و ریاضت میں مصروف رہتا ہے۔ صاحب علم، حلال وحرام میں تمیز کر سکتا ہے اور اپنے لیے جنت کے راستہ کو منور کر دیتا ہے۔ بیابان میں ساتھی، غربت میں رفیق اور بے یار کا حامی ہے۔ مصیبت میں دست گیری کرتا ہے۔ بزم میں زینت اور حریف کے مقابلہ میں اسلحہ کا کام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ علم کے ذریعہ سے معراج سعادت کو پہنچتا ہے۔ دنیوی زندگی میں شاہوں کا ہم نشین اور اخروی زندگی میں کامرانی سے ہم کنار ہوتا ہے۔''

اسلامی تعلیم کے جزئیات

مسلمان اپنی تاریخ کی ابتدا سے معاشرتی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم کو جزو لاینفک خیال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اس وقت سے دین ہی کو تعلیم کا نصب العین سمجھا جاتا ہے۔ قصہ کوتاہ دین ہی کا دوسرا نام تعلیم ہے، کیونکہ یہ قرار دیا جا چکا ہے کہ صحیح تعلیم انسان کو اللہ تعالیٰ اور تمام مخلوق کی برادری کے ساتھ اس کے فرائض کے متعلق مستند معلومات بہم پہنچاتی ہے اور اسے اس قابل بنا دیتی ہے کہ ان فرائض کو بجا طور پر ادا کر سکے۔ اسی وجہ سے مسلمان ابتدائی دور میں اپنے اخلاقی، معاشرتی اور قانونی معاملات کے متعلق الہامی فرامین کے ہر جز کو بلا تمیز از بر کرنے کے خوگر تھے اور آنحضرت کے اس ارشاد سے کہ ''علم کی تلاش ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے'' علم کا وہی مفہوم مراد ہے جو الہامی طریقہ سے آپ تک پہنچا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تعلیم کا دائرۂ عمل الہامی اجزا کے حفظ کرنے اور اسلامی مسائل کی تبلیغ تک ہی محدود رہا۔ باوجودیکہ آپ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، لیکن علم کے حصول اور تبلیغ کے لیے تحریر کی معاونت کی اہمیت پر بہت زور دیتے رہے۔ اس کا اندازہ غزوۂ بدر کے مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے جس میں بڑی دل کشی بھی ہے۔ اسلام کے مخالفین کفار کی ایک بڑی تعداد بطور جنگی اسیر، بدر کے میدان سے مدینہ منورہ میں لائی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ ہر قیدی سے سکۂ رائج الوقت کے مطابق چار ہزار کی رقم بطور فدیہ وصول کر کے اسے رہا کر دیا جائے، لیکن جب ان میں سے بعض کو اس رقم کی ادائیگی کے قابل نہ پایا گیا تو آنحضرت نے حکم فرمایا کہ ان میں سے جو شخص دس مسلمان بچوں کی جماعت کو جب ایک مقررہ معیار کے مطابق لکھنے پڑھنے کے قابل بنا دے گا تو اسے رہا کر دیا جائے گا۔ زید ابن ثابت جنھیں آنحضرت کی خدمت میں بطور کاتب وحی رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ مدینہ منورہ کے انھی بچوں میں سے تھے جو اس ترکیب سے زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ آنحضرت نے انھیں بعد میں عبرانی زبان کی وہ تحریر سیکھنے کا حکم دیا جو اس وقت مدینہ منورہ کے یہودیوں میں رائج تھی۔ خلافت راشدہ کے عہد میں عربوں کی تمام

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سرگرمیاں نئے مقبوضات میں اسلامی طرز حکومت کے استحکام تک محدود تھیں، اس لیے انھیں مسئلہ تعلیم میں اصلاح کرنے اور اسے وسیع پیمانے پر جاری کرنے کی طرف توجہ دینے کے لیے وقت میسر نہ آ سکا اور اسلام کے بنیادی اصول کی تبلیغ ہی تعلیم کا مطمح نظر برقرار رہا۔ اسلام کے ابتدائی معلم وہ قاری تھے جن کے سینے قرآن حکیم از بر ہونے کے باعث منور ہو چکے تھے اور وہ دوسروں کو اس کا درس دینے کی استعداد رکھتے تھے۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں ایسے قاری تمام مملکت اسلامی میں اس غرض سے بھیجے تھے کہ وہ عوام الناس میں اپنا ربط بڑھائیں اور مرکزی مساجد میں جمعۃ المکرّم کے روز اجتماع منعقد کیا کریں۔

تعلیم ـــــ عہد بنو امیہ میں

جب عربی حکومت مستقل طور پر مستحکم ہو گئی اور اولین تعلیم جس میں علوم کے بنیادی قواعد شامل تھے معرض وجود میں آئے تو خلافت بنو امیہ کے شروع میں ہمیں ابتدائی تعلیم کے اثرات کے حوالہ جات ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ علم کی تلاش میں عوام مساجد کی طرف رجوع کیا کرتے تھے جو عبادت گاہ ہونے کے علاوہ تعلیمی مراکز کی ضروریات کی کفیل ہوتی تھیں۔ جب کوئی بچہ چھ سال کی عمر کو پہنچتا تھا تو وہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ دکان و مکان کی طرز کی عمارتیں مستقل ابتدائی مدارس کے طور پر استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ جنھیں ''مکتب'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ قرآن حکیم کی تلاوت ہی سے تعلیم کی ابتدا ہوتی۔ اس میں زیادہ ضروری دینی مسائل اور احکام سکھائے جاتے۔ جن کی عبادت سے قبل صفائی وغیرہ کے لیے ضرورت تھی اور ایسی عبارات کو از بر کرایا جاتا جن کا نماز و دیگر اجتماعی عبادات کے دوران میں پڑھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو لکھنا سکھایا جاتا اور انھیں ریاضی کے ابتدائی قاعدوں سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ اس میں پیغمبروں کے سوانح حیات اور بزرگوں کے واقعات کا درس بھی شامل تھا۔ آخر الامر شاگردوں کو ممتاز شعرا کے کلام کا انتخاب پڑھا دینے پر تمہیدی تعلیم ختم کر دی جاتی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تعلیم ـــــ عہد بنو عباس میں

خلفائے بنو عباس کے برسر اقتدار آنے پر مملکت اسلامیہ ترقی کے درخشاں دور سے گزری۔ ہر طرف امن قائم ہو گیا اور اقتصادی خوش حالی کے ساتھ علوم عقلیہ میں سرگرمیوں کا ایسا سیلاب امنڈ آیا جو اس سے قبل مشرقی ممالک کو کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اس دور میں مسلمان یونان، ایران اور ہندوستان کے قدیمی فلسفہ و حکمت کے خیالات سے واقف ہوئے۔ اس طرح ان کے ذہنی افق میں محیر العقول وسعت پیدا ہو گئی۔ اس نوعیت کی ہمہ گیر عقلی دلچسپیاں، اعلیٰ تعلیمی نصاب کی صورت میں رونما ہوئیں جو نشو و نما پا کر بڑی بڑی علمی درس گاہوں میں جاری ہوئے۔ ان درس گاہوں کو اس دور کے دار العلوم کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ان میں علم و حکمت کی فاضلانہ تحقیق ہوتی اور انتہائی درجہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں ''مدارس'' کے نام سے یاد کیا جاتا

تھا۔ان میں زیر مطالعہ مضامین دو بڑی اقسام میں منقسم ہوتے تھے۔ العلوم النقلیہ جن میں قرآن، حدیث، فقہ اور ادب کا درس شامل تھا اور علوم العقلیہ جن میں منطق، فلسفہ، ریاضی، علم ہیئت، طبیعیات، کیمیا اور ادویہ زیر تدریس آتے تھے۔ دار العلوم اور مکاتب جو مملکت اسلامی میں مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً قائم ہوتے رہے وقت اور جگہ کی قلت ان میں زیر تعلیم مضامین کا تفصیلی جائزہ لینے سے مانع ہے۔ ۸۳۰ھ میں بغداد کے مقام پر علم وفن کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اولین دار العلوم موسوم بہ ''دار الحکمت'' کے معرض وجود میں لانے کی سعادت مامون الرشید کو نصیب ہوئی تھی۔ جامعہ ازہر، نظامیہ اور مستنصریہ نے بھی کسی لحاظ سے اسلامی تعلیم کے نشر وارتقا کے اہم فریضہ سے عہدہ برآ ہونے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

سطور بالا میں جو کچھ بیان ہو چکا ہے وہ اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ابتدا ہی سے اسلام میں تعلیم دین کی علم بردار اور اخلاقی نصب العین کی حامل رہی ہے۔ اسلامی نصاب میں ایک ایسی یکسانیت تھی جو دینی و دنیوی تعلیم میں امتیاز جائز رکھنے کی قطعی طور پر مخالف تھی۔ درحقیقت ایک خالص اسلامی معاشرہ میں ایسا سوال پیدا ہونے کا پہلے ہی سے امکان نہیں۔ اسلام میں دین زندگی سے کوئی علیحدہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ کوئی دینی عقائد کا منجمد ڈھانچا نہیں، بلکہ یہ مسلمان کی روزمرہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو مع زندگی کی خفیف ترین جزئیات کے اپنے دائرۂ نظم وضبط میں رکھنا چاہتا ہے۔ تعلیمی مسائل جیسا اہم معاشری پہلو اسلام کے دائرۂ عمل سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دینی درس جس میں لامحالہ اخلاقی تربیت بھی شامل ہے۔ اسلام میں تعلیم کی ابتدا و انتہا کا حامل رہا اور اسے ہر مرحلہ پر تعلیمی نصاب کے جسم میں روح کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسلامی تعلیم کی یہ دینی خصوصیت ہر دور میں برقرار رہی اور آج بھی جب ایک مسلمان بچہ حروف تہجی سے شناسا ہو کر پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اکثر قرآن حکیم ہی سے اس کے درس کی ابتدا ہوتی ہے۔ عربی ممالک میں ہی نہیں، بلکہ جہاں بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں عربی زبان سے بہرہ اندوز ہونے کا شوق پایا جاتا ہے یہی طریقہ رائج ہے۔ اس دستور عمل کا لازمی طریقہ یہ ہے کہ عموماً ہر وہ مسلمان جس کی تعلیم رسمی طریقہ پر ہوتی ہے وہ قرآن حکیم پڑھ کر اس الہامی کتاب کے ساتھ براہ راست ایک مستحکم رابطہ پیدا کر لیتا ہے۔

اور چونکہ قرآن اخلاقی تصورات کا اصلی مرجع ہے اس لیے اس کے ساتھ تعلق اخلاقی طور پر بے حد منفعت بخش ثابت ہوتا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

خلافت راشدہ کا تعارف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت مختلف مراحل طے کرتے ہوئے جب اپنے اتمام کو پہنچی تو عرب کی سرزمین سیاسی اعتبار سے ایک ریاست کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ قبل ازیں عرب قبائل اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار حیثیت سے رہتے تھے۔ اگرچہ ان میں رہن سہن، رسوم و رواج، لباس و طعام اور مذہبی عقائد و اعمال کا اشتراک تھا، لیکن یہ اشتراک انھیں کسی سیاسی وحدت میں تبدیل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ہماری مراد یہ ہے کہ وہ کسی ایک سیاسی یا اجتماعی نظام میں جڑے ہوئے نہیں تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی کامیابی کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی اٹھائی ہوئی دینی اور اخلاقی اصلاح کی تحریک بڑے پیمانے پر کامیاب ہوئی۔ دوسرا یہ کہ عرب منتشر اور متفرق گروہوں میں منقسم نہیں رہے، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کر گئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مدینہ جاتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ لکھ کر جس ریاست کی بنیاد رکھی تھی، اس کی حدیں چند ہی برسوں میں تمام سرزمین عرب کو محیط ہو گئیں۔ اگلے دور یعنی دور صحابہ میں یہ ریاست عرب کی سرحدوں سے نکلی اور اس نے شام، مصر اور ایران کی سلطنتوں کو فتح کر کے اپنے زمانے کی سب سے بڑی سلطنت کی صورت اختیار کر لی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیے گئے تھے۔ آپ کی دعوت کا ایک لازمی تقاضا یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا رسول مانا جائے اور رسول کی حیثیت سے آپ کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو ایک نظم اجتماعی وجود پزیر کرنے کا موقع ملا تو فطری طور پر آپ ہی اس کے پہلے حکمران ہوئے۔ اس طرح اس وعدے کی تکمیل کے اسباب پیدا ہوئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے کیا تھا۔ قرآن مجید میں یہ وعدہ کئی مقام پر بیان ہوا ہے۔ سورۂ مجادلہ میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ ’’بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت

فِی الْاَذَلِّیْنَ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ. (۵۸: ۲۰-۲۱)

کر رہے ہیں وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔''

بطور خاص صحابہ کے بارے میں ارشاد ہے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (نور ۲۴: ۵۵)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو اس ملک میں اقتدار عطا فرمائے گا۔ جس طرح اس نے ان لوگوں کو عطا فرمایا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو مضبوطی سے قائم کر دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرے ساتھ شریک نہ کریں گے۔ اور جو اس کے بعد پھر منکر ہوں گے وہی ہیں جو نافرمان ٹھیریں گے۔''

یہ ریاست کسی نسل کی تنظیم کا نتیجہ نہیں تھی، نہ یہ کسی جغرافیائی وحدت کو ایک نظام کے تحت لانے کی سعی تھی اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی فاتح تھے جن کی فتوحات نے تمام عرب کو ایک شخص کی اطاعت پر مجبور کر دیا تھا، بلکہ یہ ریاست شہادت کے اس عالمی نظام کی آخری کڑی کی حیثیت سے وجود پزیر ہوئی تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے جاری کیا تھا۔ استاد جناب جاوید احمد غامدی شہادت کے اس کام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ کے جو پیغمبر بھی اس دنیا میں آئے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دعوت الی اللہ اور انذار و بشارت کے لیے آئے۔ سورۂ بقرہ کی آیت 'کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللّٰہ النبیین مبشرین و منذرین' میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ ان نبیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے جنھیں رسالت کے منصب پر فائز کیا، ان کے بارے میں البتہ، قرآن بتاتا ہے کہ وہ اس انذار کو اپنی قوموں پر شہادت کے مقام تک پہنچا دینے کے لیے بھی مامور تھے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ حق لوگوں پر اس طرح واضح کر دیا جائے کہ اس کے بعد کسی شخص کے لیے اس سے انحراف کی گنجایش نہ ہو: 'لئلا یکون للناس علی اللّٰہ حجۃ بعد الرسل' (تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے)۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ ان کے ذریعے سے اسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ انھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اس کی جزا اور اس سے انحراف کریں گے تو اس کی سزا انھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اس

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا ان کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہی شہادت ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو جن کے ذریعے سے قائم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔''

(ماہنامہ اشراق، شمارہ اپریل ۲۰۰۳، ۱۴)

شہادت کے اس نظام کی تفصیل کرتے ہوئے استاد گرامی جناب جاوید احمد غامدی لکھتے ہیں:

''یہ شہادت درحقیقت دنیا میں خدا کی دینونت کا ظہور ہے۔ اس کی جو تاریخ قرآن مجید اور دوسرے الہامی صحیفوں میں بیان ہوئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا پہلا ظہور سیدنا نوح علیہ السلام کی دعوت میں ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام قوموں میں وقتاً فوقتاً اپنے رسول اسی دینونت کے ظہور کے لیے بھیجے۔ یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم کی بعثت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ اب یہ منصب ان کی ذریت کو بھی بحیثیت جماعت عطا ہوگا اور ان کے ذریعے سے دین کی حجت سارے عالم پر قائم کی جائے گی۔ قرآن اور بائیبل، دونوں میں اس عالمی دینونت کی سرگزشت بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ قرآن نے تین وزیتون، طور سینین اور مکہ کے شہر امین کی قسم میں اسی کا حوالہ دیا ہے۔ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں سیدنا مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد ان کے منکرین پر قیامت تک کے لیے عذاب کا فیصلہ سنایا گیا اور بنی اسرائیل میں سے ان کے ماننے والوں کی ایک نئی امت، نصاریٰ کی ابتدا ہوئی۔ تین اسی پر واقع ایک گاؤں ہے۔ اس کا ذکر انجیل میں Beth Phage کے نام سے ہوا ہے۔ اس میں Phage دراصل Fig ہے جسے عربی زبان میں تین کہتے ہیں۔ لوقا (۲۹:۱۹) میں ہے کہ مسیح علیہ السلام جب یروشلم آئے تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے اسی جگہ ٹھیرے۔ جبل طور کے بارے میں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیثیت امت اپنی زندگی اسی پہاڑ سے شروع کی۔ ام القریٰ مکہ سے بنی اسمٰعیل نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا اور خدا کی زمین پر اس کی عبادت کے اولین مرکز، بیت الحرام کی تولیت انھیں عطا کی گئی۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تینوں ذریت ابراہیم کے لیے خدا کی دینونت کے مقامات ظہور ہیں۔'' (ماہنامہ اشراق، شمارہ اپریل ۲۰۰۳، ۲۸)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بنی اسماعیل کے منصب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کو اسی بنا پر درمیان کی جماعت 'امة و سطاً' قرار دیا ہے جس سے ایک طرف خدا اور اس کا رسول اور دوسری طرف 'الناس'، یعنی دنیا کی سب اقوام ہیں اور فرمایا ہے کہ جو شہادت رسول نے تم پر دی ہے، اب وہی شہادت باقی دنیا پر تمھیں دینا ہوگی:

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ، وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا. (۱۴۳:۲)	''اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک درمیان کی جماعت بنایا تاکہ تم لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر یہ شہادت دے۔''

یہی بات آل عمران میں اس طرح واضح فرمائی ہے:

کُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ، تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ . (۳:۱۱۰)

''تم وہ بہترین جماعت ہو جو لوگوں (پر حق کی شہادت) کے لیے برپا کی گئی ہے۔ (اس لیے کہ) تم (ایک دوسرے کو) بھلائی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اللہ تعالیٰ کا جو عذاب جزیرہ نمائے عرب سے باہر کی اقوام پر مسلمانوں کی تلواروں کے ذریعے سے نازل ہوا، وہ اسی شہادت کا نتیجہ تھا۔ اس عذاب کا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اقوام کے سربراہوں کو خط لکھ کر کر دیا تھا۔ یہ خطوط جن اقوام کے سربراہوں کو لکھے گئے، ان کا علاقہ کم و بیش وہی ہے جسے تورات میں ذریت ابراہیم کی میراث کا علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جزیرہ نما میں اپنی حکومت مستحکم کر لینے کے بعد بنی اسمٰعیل کے اہل ایمان اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے اس اعلان کے ساتھ ان اقوام پر حملہ آور ہو گئے کہ اسلام قبول کر و یا زیردست بن کر جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ، اس کے سوا اب زندہ رہنے کی کوئی صورت تمھارے لیے باقی نہیں رہی۔ ان میں سے کوئی قوم بھی اصلاً شرک کی علم بردار نہ تھی، ورنہ وہ اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کے ساتھ کیا تھا۔

بنی اسمٰعیل کی یہی شہادت ہے جس سے دین کی حجت پورے عالم پر قائم ہوئی ہے، لیکن قوموں کی جزا و سزا کا فیصلہ چونکہ اللہ کے حکم ہی سے ہو سکتا ہے، اس لیے ان اقوام کے علاوہ جن کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا تھا، وہ اپنی دعوت کے منکرین کو خود کوئی سزا نہیں دے سکتے تھے۔'' (ماہنامہ اشراق، شمارہ اپریل ۲۰۰۳، ۲۹۔۳۰)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ شہادت کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو منصب امامت پر مامور کر کے جاری کیا تھا اور ان کے لیے مشرق وسطیٰ کی سرزمین کو ارض موعود[1] کی حیثیت دی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی ایک شاخ بنی اسرائیل صدیوں تک اس منصب پر فائز رہی اور اس عرصے میں حضرت موسیٰ کی حکومت، ان کے بعد ان کے خلفا کی حکومت اور بعد میں حضرت سلیمان و داؤد علیہم السلام کی حکومتیں بنی اسرائیل کے دنیا پر اقتدار اور ان کے دنیا کے لیے امام ہونے کا عملی اظہار تھیں۔ بنی اسرائیل بگاڑ اور اصلاح کے دو بڑے ادوار سے گزرے ہیں، لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت کے موقع پر ان کا بگاڑ نا قابل اصلاح ہو چکا تھا۔ حضرت مسیح کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہود میں انبیا کی بعثت موقوف کر دی گئی۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی دوسری شاخ بنی اسماعیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کی حیثیت سے مبعوث کیا گیا۔ اس طرح بنی اسماعیل نے بحیثیت جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی اور وہ بنی اسرائیل ہی کی طرح منصب امامت پر فائز ہو گئے اور مشرق وسطیٰ کا

---

[1] جس کی تعبیر تورات میں دریائے مصر سے دریائے فرات تک کی سرزمین کے الفاظ سے کی گئی ہے۔

www.jiveduimmughamidi.com www.al-mawrid.org

سارا علاقہ یعنی ذریت ابراہیم کی ارض موعود ان کی سلطنت قرار پائی۔ جس کی تعیین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علاقے کے حکمرانوں کو دعوتی خط لکھ کر کر دی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ریاست مدینہ درحقیقت بنی اسرائیل کے منصب امامت پر فائز ہونے کا نقطۂ آغاز تھا۔ یہ ریاست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں چند برسوں میں تمام سرزمین عرب تک پھیل گئی۔ مدینہ اس ریاست کا مرکز تھا۔ یہود کے مدینہ سے اخراج کے بعد مدینہ کی آبادی دو جماعتوں پر مشتمل تھی۔ ایک وہ جماعت جو مکہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کر کے آئی تھی اور دوسری مدینہ کی اصل آبادی جس نے مہاجرین کی اس جماعت کی مدد کی تھی۔ ان کی اسی خصوصیت کے باعث انھیں انصار کا نام ملا۔ یہ دونوں جماعتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے اور آپ کے دشمنوں کے ساتھ مقابلے میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑی رہیں۔ جب آپ کے دشمن نابود ہو گئے اور آپ تمام عرب کے حاکم بن گئے تو یہی دونوں جماعتیں اس سیاسی نظام کو چلانے میں بھی آپ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے تو بدیہی طور پر یہی دونوں جماعتیں خلافت کی امیدوار تھیں۔

سوال یہ تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے اقتدار کسے منتقل ہو گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے اس قضیے کا حل بتا دیا تھا۔ آپ نے گروہ انصار کو یہ واضح کر دیا تھا کہ اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ اہل عرب کے قبائل میں قبیلہ قریش کے لوگ ہی اقتدار میں آئیں گے۔ آپ نے اس کی وجہ واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ عرب کے اچھے قریش کے اچھوں کے پیرو ہیں اور عرب کے برے قریش کے بروں کے۔ مزید برآں آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عرب قریش کے علاوہ کسی کی حکمرانی قبول نہیں کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے دو پہلو ہیں۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اصل میں بنی اسماعیل کو دنیا کی امامت کا منصب عطا ہوا تھا۔ اوس وخزرج کی اگرچہ اسماعیلی قبائل کے ساتھ رشتہ داریاں تھیں، لیکن وہ اسماعیلی بہرحال نہیں تھے۔ چنانچہ ذریت ابراہیم کی امامت کے نقطۂ نظر سے انصار کا اقتدار میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ دوسری طرف اسماعیلی صرف قریش نہیں تھے، مثلاً ثقفی اور مضری قبائل بھی اسماعیلی تھے، لیکن تین صدیوں پر محیط مذہبی سیادت کے باعث قریش ہی عرب کے سیاسی مقتدا بن چکے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمیق نگاہ اس حقیقت سے واقف تھی چنانچہ انھوں نے یہ بات مبہم نہیں چھوڑی اور سیاسی اور دینی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے بعد اقتدار میں آنے والی جماعت کی واضح الفاظ میں نشان دہی کر دی۔ بعض علما کے نزدیک اوس وخزرج بھی اسماعیلی ہی تھے۔ اس بات کو درست مان لیا جائے تو پھر اس فیصلے کا سبب صرف سیاسی مصلحت ہی ہے۔

بنی اسماعیل کی اس حکومت کو اسلامی مورخین نے خلافت راشدہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ عربی زبان میں خلافت کا لفظ اقتدار کے معنی میں آتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیا ہے: 'واذ قال ربك للملائكة إني جاعل في الارض خليفة'، ''اور جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک صاحب اقتدار مخلوق بنانے والا ہوں''۔ سورۂ ص میں یہ

لفظ بالکل حکمران کے معنی میں آیا ہے: 'یا داؤد إنا جعلناك خليفة في الارض فاحكم بين الناس بالحق'، ''اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں اقتدار دیا ہے، تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو''۔ سورۂ انعام میں خلائف الارض' (۶: ۱۶۵) کی ترکیب زمین کے حکمرانوں کے معنی میں آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین صحابہ کے لیے بھی خلیفہ کا لفظ ہی رائج ہوا۔ البتہ صحابہ کی حکومت کے لیے خلفاے راشدین کی ترکیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک روایت میں آئی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:

عن العرباض بن سارية قال وعظنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما بعد صلوة الغداة موعظة بليغة ذرفت منها العيون و وجلت منها القلوب فقال رجل إن هذه موعظة مودع فماذا تعهد إلينا يا رسول الله قال أوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة وإن عبد حبشي فإنه من يعش منكم يرى اختلافا كثيرا وإياكم ومحدثات الأمور فإنها ضلالة فمن أدرك ذلك منكم فعليه بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ. (ترمذی، رقم ۲۶۰۰)

''عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد ایک وعظ کیا۔ یہ وعظ بہت بلیغ تھا۔ اسے سن کر آنکھیں بہ پڑیں اور دلوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ایک آدمی نے کہا: یہ تو وداعی تقریر ہے۔ یا رسول اللہ آپ ہمیں کیا نصیحت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں تمھیں اللہ سے ڈر کی اور سمع وطاعت کی نصیحت کرتا ہوں اگرچہ حبشی غلام ہی (حکمران ہو)، کیونکہ میرے بعد جو زندہ رہے گا وہ بہت کچھ اختلافات دیکھے گا۔ اپنے آپ کو نئی نئی باتوں سے بچاؤ۔ اس لیے کہ یہ ضلالت ہیں۔ تم میں سے جو بھی یہ زمانہ پائے اس پر لازم ہے کہ میرے اور ہدایت یافتہ خلفا کے طریقے کو اختیار کرے، وہ اس کو دانتوں سے پکڑ لے۔''

اپنے جانشینوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعبیر بعد میں آنے والی صحابہ کی حکومت کے لیے ایک اصطلاح کے طور پر رائج ہو گئی۔

ملت ابراہیم کی تاریخ ایک نظر میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد (بنی اسرائیل)

حضرت ابراہیم علیہ السلام	۱۹۹۶ سے ۱۸۲۲ قبل مسیح
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خروج	۱۴۹۱ قبل مسیح
حضرت سلیمان علیہ السلام	۹۷۵ سے ۱۰۱۵ قبل مسیح

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

بنی اسرائیل کی دو قوموں میں تقسیم	۹۲۲ قبل مسیح
آشوریوں کے ہاتھوں تباہی	۷۲۱ قبل مسیح
یروشلم کی تباہی	۵۸۶ قبل مسیح
بابل کی اسیری سے رہائی	۵۳۸ قبل مسیح
حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدایش	۵ قبل مسیح[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد (بنی اسماعیل)

منصب رسالت	۱۳ قبل ہجرت بمطابق ۶۰۸ء
ہجرت	۱ ہجری بمطابق ۶۲۱ء
میثاق مدینہ	ایضاً
فتح مکہ	۹ ہجری بمطابق ۶۳۰ء
فتح خیبر	ایضاً
فتح یمن	ایضاً
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت	۱۱ ہجری ۶۳۲ء
حضرت ابوبکر کی خلافت	ایضاً
حضرت عمر کی خلافت	۱۳ ہجری ۶۳۴ء
حضرت عثمان کی خلافت	۲۴ ہجری ۶۴۴ء
حضرت علی کی خلافت	۳۵ ہجری ۶۵۶ء
حضرت حسن کی خلافت	۴۰ ہجری ۶۶۱ء
حضرت معاویہ کی خلافت	۴۱ تا ۶۰ ہجری، ۶۶۱ تا ۶۸۰ء

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلافت راشدہ کی دینی اہمیت

شہادت علی الناس

ہم یہ بات تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ بنی اسماعیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اتمام شہادت کے بعد اس ذمہ داری پر

---

۲ William Smith, A dictionary of the Bible, (Michigan: Regency Reference Library, 1967) p13-307-343-158.

فائز تھے کہ وہ بھی لوگوں پر دین کی شہادت دیں۔ بنی اسماعیل یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم نے یہ ذمہ داری پوری کی اور پچیس تیس سال کے محدود عرصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ ہدف کے مطابق شہادت کی ذمہ داری ادا کر دی۔ اس طرح اسلام نہ صرف یہ کہ تمام متمدن دنیا کے سامنے آ گیا، بلکہ اس کے قبول کرنے میں حائل ہونے والا جبری نظام بھی ختم کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ ایک حیرت انگیز نتیجہ سامنے آیا کہ صحابہ کے فتح کیے ہوئے اکثر علاقوں کے تمام باسیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ درآں حالیکہ اس کے لیے کوئی جبری طریقہ کبھی اختیار نہیں کیا گیا۔

صحابہ کی اس حیثیت کو سمجھنے کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تمام فوج کشی اور فتوحات کو اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ مشن کے پہلو سے دیکھا جائے۔ استاد گرامی جناب جاوید احمد غامدی اپنے مضمون ''قانون جہاد'' میں لکھتے ہیں:

''شریعت کی اصطلاح میں یہ جہاد ہے اور اس کا حکم قرآن میں دو صورتوں کے لیے آیا ہے:

ایک، ظلم و عدوان کے خلاف،

دوسرے، اتمام حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف۔

پہلی صورت شریعت کا ابدی حکم ہے اور اس کے تحت جہاد اسی مصلحت سے کیا جاتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ انھی لوگوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ ''شہادت'' کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی ایسی گواہی بن جاتے ہیں کہ اس کے بعد کسی کے لیے اس سے انحراف کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم بنی اسمٰعیل کو حاصل ہوا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا . (البقرہ۲:۱۴۳)	''اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک درمیان کی جماعت بنایا تاکہ تم دنیا کی اقوام پر (حق کی شہادت) دینے والے بنو اور رسول تم پر یہ شہادت دے۔''

اس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اس کے منکرین پر اسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور اُن کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے اہل ایمان کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ انھیں جس طرح ظلم و عدوان کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو انسان کے ہاتھوں سے انجام پایا۔ اسے ایک سنت الٰہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ 'یعذبهم الله بایدیکم'، (اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے سزا دے گا) کے الفاظ میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔''

(میزان ۲۴۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ صحابہ (بنی اسماعیل) کی جماعت ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ان کی فتوحات اوران کا اعلان جنگ کسی قوم کی کشور کشائی کے جذبے اور صلاحیت کا اظہار نہیں ہے۔وہ حزب اللہ تھے۔وہ اللہ تعالیٰ کی دینونت کا نمونہ تھے۔ان کی کامیابیاں اور ناکامیاں اللہ تعالیٰ کے قانون جزاوسزا کا مظہر تھیں۔بنی اسماعیل جب تک حق پر قائم رہے۔انھیں یہ غلبہ حاصل رہا۔جب ان کی اگلی نسلوں میں انحراف نے راہ پائی وہ دنیا کی امامت کے منصب سے محروم ہو گئے۔

دین کا اگلی نسلوں تک ابلاغ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کوامت وسط قرار دیا گیا تھا۔اس حیثیت سے جہاں انھیں شہادت علی الناس کی ذمہ داری ادا کرنا تھی، اسی طرح انھیں اپنی قوم کو راہ حق پر قائم بھی رکھنا تھا۔انھوں نے اپنی اس ذمہ داری کو کما حقہ پورا کیا۔اس ضمن میں دور صحابہ کی چند نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

قرآن مجید کی حفاظت

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور ہی میں اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ قرآن مجید کا ایک سرکاری نسخہ تیار کیا جائے جو دارالخلافہ میں موجود رہے تاکہ انفرادی نسخوں سے نقل در نقل میں غلطی کے امکان کا سد باب ہو سکے۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب بعض مثالوں کے سامنے آنے سے یہ واضح ہو گیا کہ قرآن مجید کے پڑھنے اور نقل کرنے میں مسائل پیش آرہے ہیں تو نہایت اہتمام سے سرکاری نسخے کی سات کاپیاں تیار کی گئیں اور انھیں مملکت کے اہم مقامات پر اساتذہ کے ساتھ میسر کر دیا گیا تاکہ لوگ اپنے لیے صحیح متن نقل کر لیں اور اسے صحیح تلفظ اور اعراب کے ساتھ پڑھنا سیکھ لیں۔اس کے ساتھ یہ اقدام بھی کیا گیا کہ وہ انفرادی نسخے جن میں غلطیاں در آئی تھیں، انھیں تلف کر دیا گیا۔ خلافت راشدہ کی قرآن مجید کے بارے میں یہی حساسیت اور بروقت کارروائی ہے جس کا نتیجہ ایک متفق علیہ قرآن مجید کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔پوری امت بغیر کسی شک کے اسے لفظ لفظ کے اعتبار سے خدا کی کتاب مانتی ہے۔

سنت کا تسلسل

دین اسلام کا دوسرا ماخذ سنت ہے۔سنت اپنی اصل میں دین ابراہیمی کی میراث ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا احیا اور اجرا کیا اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دور میں اس پر اس اہتمام اور تسلسل کے ساتھ عمل ہوا کہ یہ بھی قرآن مجید ہی کی طرح صحابہ کے اجماع سے امت کو منتقل ہوئی ہے۔اس طرح امت مسلمہ جس طرح قرآن مجید کے باب میں کسی شبہے میں مبتلا نہیں ہے، اسی طرح سنت کے معاملے میں بھی وہ اس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت میں کسی شک میں نہیں ہے۔

تعلیم و تعلم

صحابہ رضوان اللہ علیہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض صحبت پایا تھا۔نسل انسانی نے کردار کی عظمت کی اتنی مثالیں یک جا شاید ہی دیکھی ہوں۔ دین کے بارے میں ان کی ذمہ دارانہ روش کو اس سے بڑھ کر کیا خراج تحسین پیش کیا جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کر کے کوئی صحابی کوئی بات بیان کرے تو اس میں کسی غلط بیانی کا کوئی امکان نہیں مانا جاتا۔ وہ محدثین جو راویوں کے کردار کو ہر اعتبار سے نظر تنقید سے دیکھتے اور ان کے صادق و کاذب کو ممیز کرتے رہتے ہیں سب کے سب صحابہ رضوان اللہ علیہم کو بغیر کسی اختلاف کے ہر طرح کی جرح سے بالا مانتے ہیں۔

یہی صحابہ اگلی نسلوں کی دینی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنے۔علماے اسلام نے ان صحابہ سے تربیت پانے والوں کو اگلی نسلوں سے ممتاز مانا اور انھیں تابعین قرار دیا۔صحابہ کی ایک بڑی تعداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پائے ہوئے کو آگے بانٹنے کے عمل میں جت گئی۔ چنانچہ عالم اسلام کے تمام مراکز میں قرآن و سنت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، مواعظ اور سیرت کے سیکھنے اور سکھانے کے حلقے ان صحابہ کے گرد قائم ہو گئے۔ بعد میں لکھی گئی سیرت، حدیث، فقہ اور تفسیر کی کتابیں اسی روایت کا منطقی نتیجہ ہیں، بلکہ ابتدائی دور کی بعض تصنیفات صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ، تفسیری نکات اور تاریخی بیانات سے معمور ہیں۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم کوشش کرتے تھے کہ ان کی روزمرہ کی زندگی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔یہی جذبہ انھوں نے تابعین میں بھی پیدا کیا اور انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے اچھی طرح واقف کر دیا۔ان کا یہی عمل ہے جس نے اسلامی تہذیب کو وجود بخشا اور اس کے اگلی نسلوں تک تسلسل کا ذریعہ بنے۔

غرض یہ کہ ایک طرف صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے شہادت علی الناس کے فریضے کو بے کم و کاست ادا کیا اور دوسری طرف دین کے استحکام اور فروغ میں بھی پوری تندہی سے سعی و جہد کی۔ یہی پہلو ہیں جن کے باعث ان کے دور کو خیر القرون کہا گیا ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد رفیع مفتی

امام ابن ماجہ

ان کا نام محمد ہے، ابوعبداللہ کنیت ہے اور ابن ماجہ لقب ہے۔ سلسلۂ نسب محمد بن یزید بن عبداللہ ہے۔ ماجہ ان کے والد کا لقب تھا۔ ۲۰۹ ہجری میں پیدا ہوئے۔ امام صاحب کا وطن ایران کا شہر قزوین ہے۔ اسی شہر کے حوالے سے ان کو قزوینی بھی کہا جاتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تحصیل علم

امام ابن ماجہ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو آپ کے شہر قزوین میں بڑے بڑے علما مثلاً علی بن محمد طنافسی، عمرو بن رافع، اسماعیل بن ابوسہل، ہارون بن موسیٰ تیمی وغیرہ موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ امام ابن ماجہ نے ابتدائی تعلیم کے لیے انھی لوگوں سے استفادہ کیا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اس پہلو سے امام صاحب کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔

شیوخ و اساتذہ

امام صاحب کے مشہور شیوخ اور اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں:

ابراہیم بن مندر حزامی، ابوبکر بن ابی شمبہ، جبارہ بن مغلس، صحدون بن عمارہ بغدادی، داؤد بن رشید، سہل بن اسحاق، ابراہیم واسطی، عبداللہ بن محمد۔

امام صاحب کے زمانے میں محدثین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے حصول حدیث کی خاطر مختلف ملکوں کے مثلاً خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام، بصرہ، کوفہ، مکہ، رے اور بغداد وغیرہ سفر کیے۔ امام صاحب کے ان سفروں کی

ابتدا تقریباً بائیس سال کی عمر میں ہوئی۔

مجلس درس

امام ابن ماجہ کی تدریسی خدمات کی تفصیلات ہمیں کتابوں میں نہیں ملتیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان کے شاگردوں کی موجودگی ہمیں اس بات کا پتا دیتی ہے کہ انھوں نے اپنے دور میں تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔

تلامذہ

امام صاحب سے کسب فیض کرنے والوں میں نمایاں نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار جرشی، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوالطیب احمد بن روح شعرانی، احمد بن محمد مدنی، اسحاق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تصنیف و تالیف

امام ابن ماجہ نے تین اہم کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی سنن ابن ماجہ ہے۔ یہ ابن ماجہ کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی اور دینی کارنامہ ہے، موجود کتب حدیث میں یہ ایک اہم اور متداول کتاب تصور کی جاتی ہے۔ دوسری تصنیف تفسیر کی کتاب ہے۔ علامہ ابن کثیر اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ابن ماجہ کی ایک ضخیم و جامع تفسیر ہے۔ علامہ سیوطی نے دور صحابہ اور دور تابعین کے بعد کی تفاسیر کا ذکر کرنے کے بعد تفسیر ابن جریر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ بہرحال، یہ اب ناپید ہے۔ امام ابن ماجہ کی تیسری تصنیف تاریخ کی ایک کتاب ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بھی میسر نہیں ہے۔

علما کی شہادت

امام ابن ماجہ کے فضل و کمال، جلالت شان اور حفظ حدیث کا اعتراف ہر دور کے علما نے کیا ہے۔ حافظ ابویعلیٰ خلیلی فرماتے ہیں: وہ ایک بلند پایہ، معتبر اور لائق حجت محدث تھے۔ ان کی عظمت وثقاہت پر سب کا اتفاق ہے۔ ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے۔ ابوالقاسم رافعی بیان کرتے ہیں کہ آئمۂ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے معتبر امام ہیں، ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن جوزی کہتے ہیں کہ وہ حدیث، تاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے۔ علامہ ابن خلکان کے نزدیک وہ حدیث کے امام تھے اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ابن ماجہ عظیم الشان حافظ و ضابط، صادق القول اور وسیع العلم تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ وہ صاحب سنن،

حافظ حدیث اور امام فن تھے۔

وفات

امام ابن ماجہ نے ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ ہجری کو ۶۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی وفات پر بعض شعرا نے نہایت پر درد مرثیے کہے۔

مناقب

امام ابن ماجہ کے تفصیلی حالات زندگی اخفا میں ہیں۔ اس لیے ہم کتابوں میں ان کے اخلاق و اعمال کے حوالے سے زیادہ معلومات نہیں پاتے۔ حافظ ابن کثیر نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ علم و فضل کی طرح تدین و تقویٰ اور زہد و صلاح کے بھی جامع تھے۔ احکام شریعت کی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے اور اصول و فروع میں پورے طور پر متبع سنت تھے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام ابوداؤد سجستانی

سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران ہے۔ ۲۰۲ ہجری میں پیدا ہوئے۔ خراسان کے مشہور علاقے سجستان (سیستان، ایران و افغانستان کی سرحدیں اس علاقے کو تقسیم کرتی ہیں) کو آپ کا مولد و موطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ البتہ امام ابوداؤد نے اپنی آخری عمر میں بصرہ میں جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

تحصیل علم

امام ابوداؤد کی زندگی کے ابتدائی حالات ہمیں تاریخ کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں، لیکن جس زمانے میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی، اس میں علم حدیث کا حلقہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ چنانچہ امام داؤد نے مختلف علاقوں میں جا کر علم حدیث حاصل کیا۔

شیوخ واساتذہ

امام ابوداوٗد کے ناموراساتذہ درج ذیل ہیں:

امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابوثور، یحییٰ بن معین، ہشام بن عبدالمالک طیالسی، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ۔

طلب علم کے لیے رحلات

ابوداوٗد نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق حصول حدیث کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا، وہ سجستان میں پیدا ہوئے تھے، لیکن علم حدیث کی غرض سے انھوں نے بصرہ جیسے شہر کو اپنا مسکن بنالیا، جو اس زمانہ میں علم وفن کا اور محدثین کا بڑا مرکز تھا۔ آپ کئی بار علم حدیث ہی کی خاطر بغداد تشریف لے گئے، اس کے علاوہ آپ حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ، نیشاپور، مرو اور اصبہان وغیرہ کے محدثین سے استفادہ کرنے کے لیے ان علاقوں میں تشریف لے گئے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مجلس درس

امام ابوداوٗد کی تدریسی خدمات کی تفصیلات ہمیں تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔ البتہ اُن کے شاگردوں کا وسیع حلقہ ہمیں اس کی خبر ضرور دیتا ہے کہ آپ نے تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔

تلامذہ

امام ابوداوٗد کے تلامذہ میں سے مشہور درج ذیل ہیں:

ابواحمد بن علی بن حسن بصری، ابوعلی محمد بن احمد عمرولوٗلوٗی، ابوالطیب احمد بن ابراہیم، ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد الاعرابی، ابوبکر محمد بن عبدالرزاق بن راشد۔

تصنیفات

امام ابوداوٗد کی چودہ تصنیفات کے نام ہمیں تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

آپ کی سب سے بڑی اور اہم کتاب سنن ابی داوٗد ہے۔ یہ امام صاحب کی مشہور ومقبول، اور فن حدیث کی مستند کتاب ہے۔

اس کے علاوہ آپ کی بعض کتب کے نام یہ ہیں:

کتاب الرد علی اہل القدر، کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب المسائل، مسند مالک، کتاب المراسیل۔

ان کے علاوہ بھی آپ کی بعض تصانیف ہیں۔کل چودہ تصانیف کے نام آپ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔

علما کی شہادت

محمد بن یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث میں سے ابوداؤد بھی ایک مشہور حافظ ہیں، ابوحاتم کا بیان ہے کہ وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں سے ایک امام تھے۔ جرح وتعدیل کے فن میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔صحیح وسقیم، قوی و ضعیف، مشہور ومنکر اور حسن وشاذ ہر قسم کی روایتوں کو پرکھنے میں ان کو پورا ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ جرح وتعدیل کے بعض سخت گیر آئمہ بھی علل حدیث میں ان کی معرفت کا اعتراف کرتے ہیں۔

وفات

امام ابوداؤد نے ۱۶ شوال ۲۷۵ ہجری کو ۷۲ سال کی عمر میں عالم آخرت کا سفر اختیار کیا۔عباس بن عبدالواحد نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مناقب

امام ابوداؤد علم وفن کی طرح زہد وتقویٰ کے بھی امام تھے۔ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ امام موصوف فقہ وعلم اور حفظ حدیث، زہد وعبادت اور یقین وتوکل میں یکتاے روزگار تھے۔ان کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ اُن کے کرتہ کی ایک آستین تنگ تھی اور ایک کشادہ، جب اس کا راز دریافت کیا گیا تو بتایا کہ ایک آستین میں اپنے نوشتے رکھ لیتا ہوں اس لیے اس کو کشادہ بنا لیا ہے اور دوسری کو کشادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، نہ اس میں کوئی فائدہ تھا، اس لیے اس کو تنگ ہی رکھا ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ورع وتقویٰ اور عفت وعبادت کے حوالے سے ابوداؤد بہت اونچے مقام پر تھے۔امام صاحب کو دنیا اور اس کے لذائذ و مرغوبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آپ امرا وسلاطین کے دربار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دنیوی جاہ وحشمت اور اعزاز و اکرام کی کبھی پروا نہ کی۔

امام ترمذی

ان کا نام محمد ہے، کنیت ابوعیسیٰ ہے اور نسب محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک ہے۔ آپ دریاے جیحوں کے کنارے واقع شہر ترمذ میں پیدا ہوئے۔

تحصیل علم

اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی تھی، لیکن اس زمانہ میں خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ علم و فن کا مرکز بن چکا تھا، امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کی مسند بچھ چکی تھی اور دور دور سے تشنگان علم یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ اس سے قیاس یہی ہے کہ امام ترمذی نے اپنی ابتدائی تعلیم خراسان ہی میں حاصل کی ہوگی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شیوخ واساتذہ

امام ترمذی کے مشہور شیوخ واساتذہ درج ذیل ہیں:

امام بخاری، امام مسلم، علی بن حجر مروزی، ابوکریب، محمد بن العلا، محمد بن موسیٰ الزمن، محمد بن بشار۔

طلب علم کے لیے رحلات

طلب علم کے حوالے سے آپ کے اسفار کے بارے میں ہمیں پتا چلتا ہے کہ آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کے عظیم محدثین سے استفادے کے لیے ان علاقوں کا سفر کیا۔

مجلس درس

آپ کی مجلس درس کے حوالے سے ہمیں تاریخ سے کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

تلامذہ

آپ کے مشہور تلامذہ درج ذیل ہیں:

ابو حامد احمد بن عبداللہ داؤد مروزی، ہثیم بن کلیب شامی، محمد بن محبوب، ابوالعباس محبوبی مروزی، احمد بن یوسف نسفی۔

تصنیفات

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی نے کئی کتابیں لکھی تھیں، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے صرف تین کتابوں کے نام ہم تک پہنچ سکے۔ یہ تینوں کتابیں آج بھی موجود ہیں اور کتب حدیث میں بڑا مقام رکھتی ہیں۔

سنن ترمذی، شمائل ترمذی، کتاب العلل۔

اس کے علاوہ تاریخ میں آپ کی طرف ایک اور کتاب کو بھی منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا نام ''کتاب التاریخ'' ہے۔

علما کی شہادت

سب علما آپ کی امامت وجلالت کے بارے میں متفق ہیں۔ محدث ابن حبان کہتے ہیں کہ آپ بہت بڑے حافظ حدیث اور عظیم مصنف ومولف تھے۔ ابویعلیٰ خلیلی علماے فن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے، آپ کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ امام بخاری کے یہ قابل اعتماد شاگرد سمجھے جاتے ہیں۔ امام ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں کہ جامع ترمذی کے مولف ابوعیسیٰ ترمذی باتفاق علما ثقہ ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وفات

امام ترمذی عمر کے آخری حصے میں نابینا ہو گئے تھے۔ مشہور روایت کے مطابق آپ نے ۷۰ سال کی عمر میں ۲۷۹ ہجری میں اپنے مولد ترمذ ہی میں وفات پائی ہے۔

مناقب

امام ترمذی جس درجہ کے علم کے حامل تھے، اسی درجہ کا عمل اور زہد وتقویٰ بھی آپ میں موجود تھا۔ آپ زہد وتقویٰ میں امام بخاری کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا دل خشیت الٰہی سے لبریز تھا۔ ہر وقت خدا کے خوف سے رویا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اس رونے ہی کی وجہ سے آخری عمر میں آپ کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔

امام نسائی

ان کا نام احمد ہے، کنیت ابوعبدالرحمٰن اور نسب نامہ احمد بن علی بن شعیب بن علی ہے۔ خراسان کا ایک شہر نساء ہے، یہ مرو کے قریب واقع ہے۔ اس شہر نساء کو امام نسائی کے مولد وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی کی طرف نسبت سے آپ نسائی کہلاتے ہیں۔ آپ ۲۱۵ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ایک عرصہ یہیں مقیم رہے، لیکن بعد میں آپ نے مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

تحصیل علم

امام نسائی نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی، اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ لیکن اس زمانے میں خراسان کا علاقہ علم وفن کا مرکز بن چکا تھا، وہاں بہت سے ارباب فضل وکمال موجود تھے، اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ ابتدائی تعلیم امام نسائی نے یہیں سے حاصل کی ہوگی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شیوخ واساتذہ

آپ کے مشہور شیوخ واساتذہ درج ذیل ہیں:

اسحاق بن راہویہ، ابوداؤد سجستانی، محمود بن غیلان، قتیبہ بن سعید، علی بن خشرم۔

طلب علم کے لیے رحلات

امام نسائی ۱۵ سال کی عمر میں قتیبہ بن سعید بلخی کے پاس آئے اور ان کے ہاں ایک سال دو ماہ تک مقیم رہے تاکہ ان سے علم حدیث سیکھیں۔ پھر آپ مصر چلے گئے اور کافی عرصہ وہاں مقیم رہے اور علم سیکھتے رہے اور علم کی خدمت کرتے رہے۔ وہاں ان کی تصانیف کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ مصر کے علاوہ آپ نے عراق، حجاز، جزیرہ، خراسان، شام وغیرہ کا سفر بھی کیا تھا، تاکہ وہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کریں۔

مجلس تدریس

امام نسائی کی مجلس تدریس کے حوالے سے ہمیں تاریخ سے کوئی باقاعدہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

تلامذہ

امام نسائی کے بعض تلامذہ کے نام درج ذیل ہیں:

ابراہیم بن محمد بن صالح، ابوبشیر دولابی، ابوعلی حسین محمد نیشاپوری، ابوالقاسم طبرانی، ابوجعفر عقیلی، ابوعلی محمد بن ہارون، عبدالکریم بن احمد (امام نسائی کے بیٹے)۔

تصنیفات

امام نسائی کی معلوم تصنیفات کی تعداد دس ہے:

خصائص سیدنا علی، مسند علی، مسند مالک، الضعفا والمتروکین، کتاب الجمعہ، کتاب التمیز، کتاب المدلسین، فضائل صحابہ، سنن کبریٰ، سنن صغریٰ (یہ کتاب سنن نسائی کہلاتی ہے اور یہ صحاح ستہ میں شامل ہے)۔

علما کی شہادت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام دارقطنی کا بیان ہے کہ امام نسائی اپنے دور کے تمام علماے حدیث میں یکتا اور سب سے افضل و برتر تھے۔ امام نسائی کی قوت حفظ کے حوالے سے امام ذہبی کی یہ رائے تھی کہ وہ امام مسلم سے بھی زیادہ حفظ کی قوت رکھتے تھے۔ جرح وتعدیل کے حوالے سے دارقطنی نے انھیں اپنے زمانے کے محدثین کے سرخیل قرار دیا ہے۔

وفات

۳۰۲ ہجری میں امام نسائی مصر سے دمشق تشریف لائے۔ وہاں آپ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ نے امیر معاویہ کے مقابل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل قرار دیا۔ لوگوں نے اس جرم کی پاداش میں ان کو اس قدر پیٹا کہ سخت مجروح ہو گئے اور پھر اسی حالت میں اپنے لوگوں سے تقاضا کیا کہ مجھے مکہ پہنچا دیں، مکہ جاتے ہوئے راستے میں آپ کی وفات ہو گئی۔

مناقب

امام نسائی کا اصل فن علم حدیث تھا۔ لیکن دوسرے علوم دینیہ میں بھی ان کو درک حاصل تھا۔ فقہ واجتہاد میں ان کے کمال ہی کی بنا پر انھیں حمص کے قضا وولایت کا عہدہ پیش کیا گیا تھا۔

امام نسائی کی عملی زندگی نہایت پاکیزہ تھی۔ ان کا دل خشیت الٰہی سے لبریز تھا اور خدا کی یاد اُن کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ آپ بڑے عبادت گزار اور متبع سنت تھے۔ رد بدعت اور احیا سنت آپ کا خاص مشن تھا۔ تہجد کے پابند تھے اور صوم داؤدی کے مطابق ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ ان میں جہاد کا ولولہ بھی تھا ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے تو میدان جنگ میں وہ شجاعت و بہادری دکھائی کہ لوگوں کے دلوں میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ طبیعت میں استغنا اور بے نیازی تھی۔ کبھی عزت نفس کا سودا نہیں کیا۔ آپ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں تو شریک ہوئے، لیکن ان کی مجلس اور ہم نشینی سے ہمیشہ دور رہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

فکری قیادت اور اس کے کرنے کے کام

ہم اپنا یوم آزادی ۱۴ اگست کو مناتے ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ کے دنوں میں قمری تقویم کے اعتبار سے رمضان کا مہینا تھا۔ رمضان وہ مہینا ہے جس میں اہل ایمان اپنا احتساب اور اپنے ایمان کی تجدید کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر اس ماہ مقدسہ میں ہم بحیثیت قوم کچھ دیر ٹھہر کر اپنا احتساب کر لیں تو ایسا کرنا فائدے سے خالی نہ ہو گا۔

قیام پاکستان سے لے کر جو حالات آج تک ہمیں پیش آئے ہیں، اس میں صدمات و سانحات کا عنصر بلاشبہ بہت زیادہ ہے۔ بالخصوص جب ہم اپنا موازنہ اپنے ساتھ یا اپنے بعد آزادی حاصل کرنے والی ان اقوام سے کرتے ہیں جو قدرتی اور انسانی وسائل کے اعتبار سے ہم سے بہت کم تھیں تو صورت حال کی سنگینی اور واضح ہو جاتی ہے۔ یہ موازنہ نہ بھی کیا جائے تب بھی ملک کے دولخت ہونے کا سانحہ، سیاسی نظام کی بار بار شکست و ریخت کا سانحہ، معاشی طور پر غیر ملکی قوتوں پر انحصار کا سانحہ، جاگیردارانہ نظام کی موجودگی کا سانحہ، غربت و جہالت کے تنگ ہوتے شکنجے کا سانحہ، بڑھتے ہوئے اخلاقی انحطاط کا سانحہ، قوم کے رگ و پے میں کینسر کی طرح پھیلتی بدعنوانی کا سانحہ، قومی عصبیت کی جگہ لسانی اور علاقائی عصبیتوں کے فروغ کا سانحہ اور ان جیسے کتنے سانحات ہیں جو ہماری بیلنس شیٹ کو خسارے کی ایک داستان بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ تاہم، جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، رمضان کا مہینا مرثیہ گوئی کا نہیں، احتساب، تجدید اور عزم نو کا مہینا ہوتا ہے، اس لیے ہم اس داستان زیاں کو طول دینے کے بجائے پہلے حالات کے تجزیے اور پھر لائحۂ عمل کی طرف آتے ہیں۔

ایک معاشرہ اور ایک قوم، انسانی وجود کی طرح اپنی زندگی کے متعین ادوار میں بٹی ہوتی ہے۔ قوم کے رویے، اس کے عروج و زوال اور اس کے ضعف و قویٰ کے بیش تر عناصر کا تعلق قوم کے مرحلۂ زندگی سے ہوتا ہے۔ ہم پاکستانی قوم کو جب تاریخ کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے یعنی تعمیر و شناخت کے مرحلے میں ہے۔ اس مرحلے تک آتے آتے قوم کا ایک اجتماعی خمیر تیار ہو چکا ہوتا ہے جسے ہم قومی مزاج سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بالکل اس

بچے کی طرح جس کی شخصیت کے خط وخال لڑکپن تک نمایاں ہوکر سامنے آنے لگتے ہیں۔تاہم یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب والدین اور بزرگ اپنی تربیت کے ذریعے سے شخصیت کے منفی عناصر کی تعدیل کر کے اس کی خوبیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ٹھیک یہی کچھ قومی زندگی کے اس دوسرے مرحلے میں ہوتا ہے۔تاہم قوم کے معاملے میں رہنمائی کا کام بزرگوں کے بجائے فکری قیادت سرانجام دیتی ہیں۔فکری قیادت کیا ہوتی ہے،اسے اگر اختصار سے سمجھنا ہے تو اقبال کا وہ شعر کافی ہے جو انھوں نے کہا تو مسلمان کے بارے میں تھا،مگر سچ یہ ہے کہ یہ شعر ایک فکری قائد کی خصوصیات کا بڑا جامع بیان بھی ہے:

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

بدقسمتی سے ہمارے ہاں فکری قیادت کے نام پر جو لوگ معروف رہے ہیں،ان کا جنوں بے علم اور ان کا اندیشہ بے یقیں رہا ہے۔یہ لوگ،الا ماشاءاللہ،ان تمام اوصاف سے متصف ہیں جو ایک فکری قیات کو پنپنے ہی نہیں دیتے مثلاً جذباتیت، انتہا پسندی،تقلید،مرعوب ذہنیت،حالات سے باخبر مگر غیر متاثر رہ کر تجزیہ کرنے کی صلاحیت کا فقدان،اور ان سب کے ساتھ ماضی اور حال کے اس علم سے محرومی جو انسان کو مستقبل میں دیکھنے کے قابل بناتا ہے۔

ہمارے نزدیک موجودہ حالات میں ایک حقیقی فکری قیادت کے نہ ابھرنے کا سبب یہ ہے کہ فکری رہنمائی کے اس کام میں بہت کچھ سب وشتم برداشت کرنا پڑتا ہے۔لوگوں کی قدیم سے وابستگی اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ نئے افکار و خیالات کو قبول نہیں کرتے۔ہمارے معاملے میں صورت حال کو سنگین تر بنانے والا عنصر ہمارے قومی مزاج میں جذباتی انداز فکر کا غلبہ ہے جس کے نتیجے میں کسی ایسے نقطۂ نظر کو جس کا واحد اثاثہ دلیل ہو،قبولیت ملنا آسان نہیں۔

قیام پاکستان سے قبل ہماری فکری قیادت کو یہ سہولت حاصل تھی کہ ہندووں کے بالمقابل ہونے کی بنا پر انھیں اپنی قوم میں کچھ نہ کچھ پزیرائی مل جایا کرتی تھی۔پھر یہ بھی کہ ہندو غلبے کے پس منظر میں انھیں بہرحال اس بات کا یقین کامل ہوتا تھا کہ ان کی رہنمائی پر قوم کی موت وزندگی کا انحصار ہے،جس کے لیے گالیاں کھانا کوئی بڑی قیمت نہیں،مگر اب صورت حال بہت مختلف ہے۔نہ صرف وہ رویے جو فکری قیادت کے لیے زہر قاتل ہیں،عام ہیں،بلکہ قوم کو'خوش کر کے' جو عزت وتکریم اور پزیرائی حاصل ہوتی ہے،اس کی محرومی کو جھیلنا اور کفر وگمراہی کے فتاویٰ کو سہہ جانا وہ چوٹی ہے جسے سر کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔

پاکستانی قوم کے سانحات کی جو فہرست ہم نے اوپر بیان کی ہے،ہمارے نزدیک اس میں سب سے اوپر بیان کرنے کی چیز یہی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد قوم میں کسی طاقت ور،موثر اور حالات سے بلند ہوکر سوچنے اور رہنمائی کرنے والی قیادت کا فقدان رہا ہے۔ہمارے نزدیک قوم کا اصل مسئلہ یہی ہے۔باقی جو دیگر مسائل ہیں،وہ اسی سبب سے پیدا ہورہے ہیں۔جو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کچھ کشمکش و پریشانی نظر آتی ہے، وہ فکری قیادت کی غلط رہنمائی کی بنا پر ہے۔ ہم اس کو اپنی تاریخ کی ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل برصغیر کی مسلم قومیت کو، جو ابھی اپنے ارتقا کے ابتدائی دور یعنی تشکیل کے مرحلے میں تھی، یہ چیلنج پیش آ گیا کہ ان کی خارجی طاقت اورنگ زیب کے بعد زوال پزیر ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد وہ اس نام نہاد حکومتی تحفظ سے بھی محروم ہو گئے۔ اس وقت برصغیر کے مسلمانوں کے لیے سب سے اہم مسئلہ حکومتی چھتری سے محرومی کے بعد اپنے تحفظ و بقا کا تھا۔ اس چیلنج کا جو جواب اس وقت کی ہماری فکری قیادت نے دیا، اس کا نتیجہ پاکستان کی شکل میں آج دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہندو غلبے کا خارجی چیلنج بڑی حد تک باقی نہ رہا، مگر ایک دوسرا زیادہ پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہ مسئلہ چھوٹی عصبیتوں کے باہمی تعامل و انجذاب کا تھا۔ یہ چیلنج قومی زندگی کے دوسرے مرحلے یعنی مرحلۂ تعمیر و شناخت میں لازماً پیش آتا ہے، مگر ہمارے معاملے میں ہندو اکثریت کے خوف اور اقتدار سے محرومی نے اسے دبا دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ مسئلہ پوری سنگینی کے ساتھ سامنے آ گیا۔

مختلف عصبیتوں اور معاشرے کے طبقات کے حقوق و فرائض کے تعین اور وسائل کی تقسیم کا یہ چیلنج اپنے حل کے لیے وہ تاریخی شعور چاہتا تھا جس کی طرف صرف ایک فکری قائد ہی توجہ دلا سکتا ہے۔ فکری قیادت کی ذمہ داری تھی کہ وہ عملی سیاست سے دور رہ کر سیاسی قیادت کو یہ باور کرائے کہ اس مسئلے کو حل کیے بغیر ایک اجتماعی عصبیت وجود میں آنے سے پہلے ہی منتشر ہو جاتی ہے۔ اور یہ کہ یہ محض ایک سیاسی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اپنی گہرائی میں یہ ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس پر قوم کی موت و زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ ہماری فکری قیادت نہ صرف اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی، بلکہ اس نے اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر ایک نئی کشمکش کا آغاز کر دیا ——— یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس وقت مسلمانوں کی اخلاقی حالت اور ان کے فقہی ذخیرے کی علمی حیثیت کیا ہے۔ انھیں یہ غلط فہمی ہو گئی (اور بدقسمتی سے آج کے دن تک ہے) کہ خلافت راشدہ کی کامیابی کسی قسم کے نظام کی مرہونِ منت تھی۔ وہ یہ نہ جان سکے کہ خلافت راشدہ کسی نظام کا نہیں، بلکہ اعلیٰ ترین سیرت و اخلاق کے لوگوں کے اقتدار اور انتظام میں آنے کا نام ہے۔ اسی طرح وہ اس حقیقت سے بے خبر رہے کہ جس فقہی ذخیرے کو وہ اسلامی نظام کے نام پر پیش کر رہے ہیں (اور اب نافذ کرا چکے ہیں)، وہ کس طرح عصر حاضر میں غیر متعلق، بلکہ غیر موزوں ہو چکا ہے۔ ان کے نزدیک چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل ہوا، اس لیے عوام کا اصل مسئلہ انھیں اسلام کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اس سطحی انداز فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستانی قوم خلیج بنگال اور اسلامی نظام آئین پاکستان کی نذر ہو کر دنیا کی نگاہ میں مذاق بن گئے۔

ہماری جدید تاریخ کی یہ مثال بہت اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ ہماری فکری قیادت کی ذہنی سطح اور اس کا سرمایۂ ہنر کیا ہے۔ فکری قیادت تو حقائق کے وجود میں آنے سے پہلے ہی انھیں دیکھ لیتی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ قوم ایسی 'فکری قیادت' سے

آزمائی گئی ہے جسے بر سر زمین حقائق بھی نظر نہیں آتے۔اس صورت حال کا بہت کچھ سبب ، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ہمارے قومی مزاج میں جذباتیت اور غیر عقلی انداز فکر کی جڑوں کا بہت مضبوط ہونا ہے۔ان حالات میں قوم کی فکری رہنمائی کے لیے اٹھنے والوں کے سامنے بنیادی نصب العین قومی مزاج کی اصلاح ہونی چاہیے۔ دور تشکیل سے ہمارا قومی مزاج اور اجتماعی انداز فکر عقلیت کے بجائے جذباتیت پر استوار ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کا ہر مذہبی اور سیاسی لیڈر، جو دلوں کے تار چھیڑ سکتا ہو، بآسانی لوگوں کی عقل ماؤف کر دیتا ہے۔جس کے بعد قوم کولھو کے بیل کی طرح لیڈر کے پیچھے گھومتی رہتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس نے ترقی کی راہ میں بڑا سفر طے کر لیا ہے۔ چنانچہ جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز فکر کا فروغ اس قوم کی ترقی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔جذباتیت کے بعد قومی مزاج کی اصلاح کا دوسرا اہم پہلو اس میں مذہب اور اس کی اساسات کی تشکیل نو ہے۔ یہ بات ذرا اہم ہے، اس لیے اس کی کچھ تفصیل ہم ذیل میں بیان کیے دیتے ہیں۔

ہماری قوم کے اجتماعی مزاج میں مذہب کی جو اہمیت ہے، برصغیر میں مسلم قومیت کے ارتقا پر نگاہ رکھنے والا کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا ،مگر مسئلہ یہ ہوا ہے کہ پچھلے دو سو سال میں دنیا ایک گاؤں بن چکی ہے۔اس جدید دنیا میں مغرب کو امام کی حیثیت حاصل ہے۔مغرب نے جو کچھ ترقی حاصل کی ـــــ اور بلاشبہ یہ انسانی تاریخ کی عظیم ترین ترقی ہے ـــــ وہ مذہب سے دامن چھڑا کر کی ہے۔آج اقوام عالم میں سے کوئی بھی مذہب کو اجتماعی زندگی میں فیصلہ کن مقام دینے کے لیے تیار نہیں۔ایسے میں ہم اپنے مذہبی تشخص پر اصرار کر کے ایک بہت بڑا چیلنج قبول کرتے ہیں۔

اس چیلنج کے جواب میں ہمارے اہل فکر نے تین نقطۂ نظر پیش کیے ہیں۔ پہلا حل یہ پیش کیا گیا کہ اسلام جن عقائد واعمال کو پیش کر رہا ہے، انھیں مغربی معیارات کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور جو اس بارگاہ میں غیر معتبر ٹھہرے، اسے رد تو نہ کیا جائے ،مگر تاویل کی گنگا سے اشنان کرا کے جدید ذہن کے لیے قابل قبول بنا دیا جائے۔اس حل کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ مذہب قومی مزاج میں موجود بھی رہتا تھا اور زمانے کی عقلیت اس پر سوال بھی نہیں اٹھا پاتی تھی۔انگریزوں سے متاثر ہماری نومولود اشرافیہ میں اس حل کو بڑی پزیرائی ملی ، کیونکہ 'رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی' پر مبنی اس حل میں ان کے لیے بڑی سہولت تھی۔تاہم تاویل کی یہ گنگا علمی سطح پر اتنی آلودہ تھی کہ کسی معقول اور سلیم الفطرت آدمی کے لیے اس کو حلق سے نیچے اتارنا بڑا مشکل تھا۔پھر اہل علم کی تنقیدوں نے تاویل کے اس طریقے کو ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر کر دیا۔سب سے بڑھ کر جن لوگوں نے اسے قبول کیا تھا، ان کی اگلی نسلوں کے لیے یہ مسئلہ ہی نہ رہا کہ اسلام کو قوم کے اجتماعی مزاج میں باقی رکھا جائے۔آج بھی یہ حل کچھ خواتین وحضرات کی طرف سے سامنے آتا رہتا ہے،مگر اس کی بنیاد میں جو کمزوری ہے یعنی مغربی معیارات پر اسلام کو عصر حاضر کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں تاویل کی سان پر چڑھانا، اسے معاشرے میں قبولیت عام حاصل نہیں کرنے دیتا۔

دوسرا حل یہ سامنے آیا کہ اس چیلنج کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں مغرب کی طرح مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ قرار دے کر اسے اپنے اجتماعی نظم سے غیر متعلق کر دینا چاہیے۔ پچھلی ربع صدی میں مذہبی حلقوں کی قوت کی بنا پر اس حل کے پیش کرنے والے اگرچہ کھل کر سامنے نہیں آتے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری اشرافیہ اور دیگر فعال طبقات عملی طور پر نہ صرف اس حل سے متاثر ہیں، بلکہ عملاً اسے اختیار کر چکے ہیں۔ خاص طور پر مغرب نے مذہب کے معاملے میں پچھلی نصف صدی میں اپنے موقف میں جو نرمی پیدا کی یعنی فرد کا ذاتی معاملہ ہونے کے ساتھ یہ ایک ثقافتی مظہر ہے اور اس سے وابستگی حماقت نہیں، ثقافت کا نام ہے، اس کے بعد ہمارے ہاں اس حل کی قبولیت کے امکانات سب سے زیادہ روشن ہو چکے ہیں۔

چیلنج کا تیسرا جواب جو ہم نظری طور پر ہی نہیں بڑی حد تک عملاً بھی دے چکے ہیں، یہ ہے کہ دین کے نام پر جو کچھ بھی فقہی ذخیرہ موجود ہے، اسے فرد و معاشرے پر بالجبر ٹھونس دیا جائے۔ اس طرح ہم نظری طور پر مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر مذہبی بھی ہو جائیں گے۔ ہمارا آئین و قانون بڑی حد تک اس اعتبار سے مذہبی ہو چکا ہے۔ ہمارے عوام الناس کو جو پہلے ہی اپنے قومی مزاج کی بنا پر مذہبی ہوتے ہیں، جب باور کرا دیا جاتا ہے کہ مذہب میں سوال اٹھانا کفر ہے تو ان کی ایک بڑی تعداد بھی اپنی عقل کو کانوں تک محدود کر کے دین کی مروجہ اور مبینہ تعبیر کو اختیار کر لیتی ہے۔ تاہم عملی دنیا میں یہ تعبیر فرد و اجتماع کو بار بار ایسے اندھیرے غار تک پہنچا دیتی ہے جہاں کوئی روشنی اگر رہ جاتی ہے تو وہ صرف ایمان کی ہوتی ہے ـــــ بلا عقل وہ ایمان جو ایک مسلمان ہی کے پاس نہیں یہودی، عیسائی، ہندو اور بدھ مت کے ماننے والوں کے پاس بھی ہوتا ہے۔

ان تینوں جوابات کا جائزہ لے لیجیے۔ ابتدائی دو کو دین کے تا قیامت ہدایت ہونے کا ہمارا یقین رد کر دیتا ہے، جبکہ تیسرے حل کو ہماری عقل اور عملی زندگی کے مسائل قبول نہیں کرنے دیتے۔ یہ ہمارا مخمصہ ہے جس سے ہم نکل نہیں پا رہے۔ ہمارے مقتدر طبقات ابتدائی دو حلوں کی طرف مائل ہیں جس کے بعد مذہب عملاً ہمارے قومی خمیر سے نکل جائے گا۔ یہ بات کسی اور قوم کے لیے تو قابل قبول ہو سکتی ہے، مگر ہمارے قومی وجود کے لیے اس کا مطلب موت ہو گا۔ جبکہ مذہبی قیادت اور ان کے زیر اثر مڈل کلاس تیسرے حل کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، مگر یہ مبالغہ نہیں ایک حقیقت ہے کہ یہ حل ناقابل عمل ہے۔ دین کے نام پر پیش کیا جانے والا ہمارا اکثر فقہی سرمایہ عصر حاضر میں بالکل غیر متعلق ہو چکا ہے۔ اس کے کئی اجزا پہلے بھی غلط تھے اور آج بھی ہیں۔ زمانی حالت کی بنا پر پہلے وہ قابل عمل تھے، مگر آج وہ قابل عمل بھی نہیں رہے اور مستقبل میں تو قابل توجہ بھی نہیں رہیں گے۔ تاہم چونکہ ابھی تک مسئلے کا کوئی واضح حل سامنے نہیں آیا، اس لیے معاشرے میں ایک کشمکش جاری ہے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کشمکش کی دو انتہاؤں کا نام انتہا پسندی اور مغرب پرستی ہے۔

ہمارے نزدیک اس مسئلے کا حل قومی مزاج کی مذہبی اساسات کو بدل دینا ہے۔ یہ اساسات ہمارے نزدیک توہم پرستی، تصوف، قدیم فقہ اور روایت پرستی ہیں۔ اس قوم کی مذہبیت میں قرآن کو کوئی حیثیت حاصل نہیں، بلکہ قرآن کی بے وقعتی کا عالم یہ ہے کہ کوئی قصہ، کوئی فتویٰ، کوئی روایت سنا دیجیے، لوگ قرآن کو پیٹھ پیچھے پھینک دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بعض

دوسرے لوگوں نے بھی اس حقیقت کو محسوس کیا اور اس کے بعد وہ معاشرے میں قرآن کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اس دعوت کا حق تو کیا ادا کرتے انھوں نے قرآن کی ایسی نامعقول تاویلات کیں جن کے بعد عوام وخواص کا یہ عقیدہ مزید پکا ہو گیا کہ قرآن وہ بھاری پتھر ہے جسے چوم کر رکھ دینے ہی میں عافیت ہے۔ اس کے ساتھ سنت کے انکار اور حدیث کے رد نے اس راہ میں وہ کانٹے بوئے ہیں کہ آج قرآن کی بنیاد پر دین سمجھنے کی دعوت لے کر اٹھنا بڑے حوصلے کا کام بن چکا ہے۔

قرآن کو چھوڑ کر ان بنیادوں پر بننے والا مذہبی ذہن اور تشکیل پانے والا مذہبی سرمایہ عصر حاضر میں بلاشبہ قطعاً غیر موزوں ہو گا۔ یہ اگر بن سکتے ہیں تو فرد کا ذاتی مسئلہ یا قوم کا ثقافتی سرمایہ بن سکتے ہیں۔ دور جدید میں فرد و اجتماع کے عملی معاملات ان کے سہارے نہیں چل سکتے، لیکن رب العالمین کا نازل کردہ کلام وہ ابدی رہنمائی ہے جو ہر دور میں قابل عمل ہے۔ ہم سے یہ کوتاہی ہوئی ہے کہ ہم نے قرآن کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری اس کوتاہی کے باوجود ان لوگوں کو پیدا کیا جنھوں نے راہ کے سب سے بھاری پتھر یعنی دین پر علمی تحقیق کا بار اٹھا لیا۔ پچھلی ایک صدی میں امام فراہی اور ان کے تلامذہ نے قرآن کی بنیاد پر دین پر غور و غوض کی طرح ڈالی اور اب کم و بیش اس ابدی دین کو سامنے رکھ دیا ہے جو آج کے دور میں بھی اتنا ہی قابل عمل ہے جتنا چودہ سو برس قبل تھا۔ اس دین میں نہ قرآن کی تاویلات کی جاتی ہیں نہ سنت کا انکار۔ نہ حدیث کو فراموش کیا جاتا ہے نہ اسلاف کی خدمات کا انکار ہوتا ہے۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ یہ کام ابھی محض علمی کام ہے۔ کسی قوم کا اجتماعی مزاج بدلنا کسی علمی کام کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جب تک یہ ایک فکری تحریک میں نہیں بدلتا، اس وقت تک برگ و بار نہیں لا سکتا۔ بہترین اذہان، اعلیٰ ترین استدلال کے ساتھ برسوں جہاد کرتے اور گالیاں کھاتے ہیں تب کہیں جا کر کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔

ہم نے یہ حقائق سوچنے والے اذہان کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری اس صدا پر کان نہ دھرے گئے تو آنے والے دنوں میں یہ بات یقینی ہے کہ مذہب اسی طرح ہمارے قومی مزاج سے خارج ہو جائے گا جس طرح مغرب میں ہوا تھا۔ اس لیے ضروری ہے کہ قوم کے سنجیدہ اور باشعور عناصر اس کام کی غیر معمولی اہمیت کو محسوس کریں اور اس کے ابلاغ کو اپنا مسئلہ بنائیں۔ اسی طرح جذباتی انداز فکر کے بجائے استدلال اور خطابت و انشا پردازی کے بجائے تعلیم و تدریس کے طریقے پر قوم کی تربیت ہمارا مسئلہ بننا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری فلاح کا کوئی راستہ ان گھاٹیوں کو عبور کیے بغیر سامنے نہیں آ سکتا۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نعیم احمد بلوچ

''تذکار بگویہ''

(1945-1650)

مصنف: ڈاکٹر صاحب زادہ انوار احمد بگوی

ضخامت: ۹۱۰ صفحات

قیمت: ۵۵۰ روپے

ناشر: مجلس مرکزیہ حزب الانصار پاکستان، بھیرہ

ملنے کے پتے: شعبۂ نشر و اشاعت، مجلس حزب الانصار بھیرہ۔

ادارۂ تدبر قرآن و حدیث، رحمٰن سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دریائے جہلم کے کنارے واقع ''بھیرہ''، ضلع سرگودھا کا ایک تاریخی قصبہ ہے۔ اس کا شمار پنجاب کے ان علاقوں میں ہوتا ہے جو قدیم زمانے سے برصغیر پر حملہ آوروں کی گزرگاہ اور قیام گاہ رہے ہیں۔ ۳۲۶ ق م میں یونان کے ظالم فاتح سکندر اعظم کا اس وقت کے حکمران راجہ پورو (یونانی تلفظ پورس) سے فیصلہ کن معرکہ اسی قصبے کے قرب و جوار میں ہوا تھا۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے بھیرہ کا ذکر ''علم و فنون'' کے مرکز کی حیثیت سے کیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لیے آیا تو اس نے بھیرہ میں بھی قیام کیا۔ مغلوں نے جب ہندوستان پر قسمت آزمائی شروع کی تو ان کی گزرگاہ میں بھی بھیرہ ایک اہم قیام گاہ تھا۔ تزک بابری میں ظہیر الدین بابر نے بھیرہ میں اپنے دو ہفتوں کے قیام کا ذکر کیا ہے۔ ۱۵۴۰ء میں ایک فوجی مہم کے دوران میں شیر شاہ سوری بھی کچھ عرصے کے لیے بھیرہ میں مقیم رہا۔ اسی قیام کے دوران میں شیر شاہ سوری یا اس کے کسی جانشین نے یہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کی۔ اپنی وسعت، خوب صورتی اور عمارتی شکوہ کے لحاظ سے یہ

مسجد مسلمانوں کی شان وشوکت کا شان دار مظہر تھی۔ جب مغلوں کے زوال کے بعد پنجاب پر سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو بادشاہی مسجد لاہور کی طرح یہ بھی ان کی سکھا شاہی سے محفوظ نہ رہی۔ انھوں نے مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب ہندوستان کی حکومت کا نظم ونسق ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھوں میں لیا تو مقامی لوگوں سے بہتر تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی کے نتیجے میں مقبوضہ مساجد کو واگزار کیا جانے لگا۔ چنانچہ اسی دور میں ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ بھیرہ کی اس تاریخی مسجد کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ اس تعمیر کا سہرا اپنے دور کے ایک ممتاز اور جید عالم دین علامہ احمد الدین بگوی کے سر ہے جنھوں نے یہ کارنامہ کسی حکومتی سرپرستی کے بغیر عوام میں اپنی غیر معمولی مقبولیت کے باعث مقامی مسلمانوں کی مدد سے سرانجام دیا۔ یہ علامہ احمد الدین بگوی وہی عالم دین ہیں جو بادشاہی مسجد لاہور کی واگزاری کے بعد اس کے پہلے امام وخطیب مقرر ہوئے۔ زیر نظر کتاب اسی بگویہ خانوادے کے علما و مشائخ کے علمی، ملی اور سماجی کارناموں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر صاحب زادہ انوار احمد بگوی اسی بگویہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انھوں نے کتاب کی اس جلد اول میں خاندان بگویہ کے مورث اعلیٰ مولانا حافظ نور حیات بگوی سے اپنے دادا مولانا ظہور احمد بگوی تک کے علما و مشائخ کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تذکرے میں مصنف کا طرز تحریر محض ایک عقیدت مند کا سا نہیں، بلکہ کتاب کے دیباچہ میں لکھے ان الفاظ کے مطابق ہے:

> ''حالات بیان کرتے ہوئے راقم نے پوری کوشش کی ہے کہ غیر ضروری طوالت نہ ہو۔ رسمی اور ثقیل القابات سے گریز کیا جائے۔ جو بیان ہو وہ سادہ اور عام فہم زبان میں ہو۔ ہر واقعہ صحیح اور مستند ہو۔ مطالعہ کرنے والوں کے لیے تذکاران کی دلچسپی، معلومات اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔''(۳۰)

کتاب میں جن شخصیات کا تفصیلی تذکرہ ہے، ان کا تعلق ایسے دور سے ہے جب مسلمانان ہند انگریزوں سے آزادی کی مسلح جدوجہد میں ناکامی کے بعد سیاسی تگ ودو میں مصروف تھے۔ اس کتاب میں مصنف نے اس باشعور طبقے کی ایک زندہ تصویر سامنے رکھ دی ہے۔ چنانچہ قاری تاریخ خلافت، فتنۂ قادیانیت، کانگرس، مسلم لیگ اور خاک سار تحریک سے تعلق رکھنے والے علما و مشائخ کے اختلافات اور تحریک پاکستان میں علما کی جدوجہد کے مختلف مراحل کو اپنی آنکھوں کے سامنے گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مصنف نے مشائخ بگویہ کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی منتخب تحریریں، ان کی تعریف وموافقت میں لکھے گئے مضامین، ان کے متعلق اخبار وجرائد کے تجزیے وتبصرے، ہندوستان بھر کے جید علما اور ہندو مسلم رہنماؤں کے ساتھ ان کی خط کتابت کا ریکارڈ، ان کے پیغامات اور ان سے متعلق مختلف واقعات پر اس دور کے شعرا کا فارسی، اردو اور پنجابی کلام بھی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ اس سے کتاب میں بڑی معنویت اور وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اسے ایک مستند تاریخی اور قیمتی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مصنف کا طرز تحریر اس قدر دلچسپ اور تاریخی دستاویز اور تحریروں کے انتخاب کا ذوق اس قدر ہمہ جہت ہے کہ قاری اس ضخیم کتاب کو جہاں سے بھی پڑھنا شروع کرتا ہے،

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

تذکارِ بگویہ اگرچہ خاندان بگویہ کے صاحب علم وعزیمت اسلاف کی دینی، روحانی، سماجی اور سیاسی خدمات کا احاطہ کرتی ہے، لیکن اس کے مصنف ومرتبین نے اس قدر محنت، ذہانت اور دیانت سے کام لیا ہے کہ یہ ایک خانوادے ہی کی نہیں، بلکہ برصغیر پاک وہند میں علماومشائخ کی تاریخ کا ایک مستند باب بن گئی ہے جو تاریخ کے اس شعبے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ اس اعلیٰ علمی وتاریخی دستاویز مرتب کرنے پر مصنف اور ان کے معاون مولانا ابراراحمد بگوی، خطیب و امام شیر شاہی مسجد بھیرہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com